مرتبہ

جگن ناتھ آزاد

ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

پہلی بار:- ۱۹۵۹ء

طابع:- محبوب المطابع برقی پریس، دہلی

ناشر:- ادارۂ فروغِ اردو. لکھنؤ

قیمت چار روپے

فہرستِ مضامین

عرضِ حال

دہلی کتاب گھر، دہلی کو قائم ہوئے ابھی دو ایک برس ہی ہوئے ہیں، اس تھوڑی سی مدت میں اس ادارے نے نامساعد حالات کے باوجود چند کتابیں شائع کی ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ ان کتابوں کو برصغیر ہند و پاکستان میں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں "گنجِ معانی" (دوسرا ایڈیشن) "رباعیاتِ مجروح" (دوسرا ایڈیشن) "بیکراں" (تیسرا ایڈیشن) "جنوبی ہند میں دو ہفتے" اور "دارہ و" (دوسرا ایڈیشن) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس ادارے کی طرف سے اب یہ طے کیا گیا ہے کہ اُردو شعراء کے متعلق ایک سلسلہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ غالباً یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اردو میں اس قسم کی کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ ہم اس کمی کو پورا کرنے کا لائحۂ عمل لے کر میدان میں آرہے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ حتی المقدور اس ضمن میں تھوڑا

بہت کام کرنے کے ہم آرزومند ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "تلوک چند محروم" اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے علاوہ جو کتابیں زیرِ طبع ہیں اُن کے عنوانات یہ ہیں۔ جوش ملیح آبادی۔ فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی۔ حفیظ جالندھری، انشاء اللہ یہ چاروں کتابیں ۱۹۵۷ء ہی میں ہدیۂ ناظرین ہوں گی۔ اور ہر کتاب کے شروع میں اس سلسلے کی آئندہ مطبوعات کی ایک جھلک موجود ہوگی۔

ہمیں پوری توقع ہے کہ اُردو شعر و ادب کے شائقین ان مجموعوں کا اسی گرمجوشی سے استقبال کریں گے جس کا اظہار وہ دہلی کتاب گھر دہلی کی دوسری مطبوعات کے متعلق کرتے رہے ہیں[1]۔

جنوری ۱۹۵۷ء — ناشرین

---

[1] زیرِ نظر کتاب ابھی طباعت کے ابتدائی مرحلوں ہی میں تھی کہ دہلی کتاب گھر کے سامنے بعض مشکلات رونما ہوئیں۔ ممکن تھا کہ اس کتاب کی طباعت و اشاعت ایک غیر معین مدت کے لئے معرضِ التوا میں پڑ جاتی، اور اس سلسلے کی دوسری کتب کی اشاعت بھی رُک جاتی، لیکن اس موقع پر ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ نے دستِ تعاون بڑھایا اور اس کتاب کی طباعت اپنے ذمے لے لی، چنانچہ اب یہ کتاب ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ کی جانب سے شائع ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ اس سلسلے کی باقی کتب بھی ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ ہی کی جانب سے شائع ہوں گی۔

مؤلف

فرمودۂ عبدالقادر

'گنجِ معانی' سے ماخوذ

میرے قدیم کرم فرما جناب تلوک چند محروم اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض اور نعمتوں سے محروم رہے ہوں تو اور بات ہے، مگر خدا داد لطفِ سخن اور موزونیٔ طبع سے اُنھیں حصّہ وافر ملا ہے۔ اور اُن کا کلام خلعتِ قبولِ عام سے محروم نہیں رہا۔ بڑے بڑے سخنوروں نے ان کی شاعری کو سراہا ہے، اور اُن کے حُسنِ بیان کی تعریف کی ہے۔ شائقینِ اُردو ادب یہ سُن کے خوش ہوں کہ کلامِ محروم جو اس وقت تک بیشتر ادبی رسائل کے اوراق میں اور کچھ حصّہ مصنّف کے مسودوں میں محفوظ تھا، ایک دلچسپ مجموعے کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ مجموعہ میرے سامنے ہے، اور میں جنابِ مصنّف کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اشاعت سے پہلے اپنی کتاب کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔ اُن کی خواہش ہے کہ میں اس کتاب کا دیباچہ لکھوں۔

یہ فرمائش اُن تعلّقات کی بِنا پر کی گئی ہے، جو رسالہ مخزن کے دورِ اوّل

کے زمانے سے میرے اور جنابِ محروم کے درمیان قائم ہیں۔ آپ کی کئی نظمیں پہلے مخزن میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی، حضرتِ محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں، مگر اُن کی شاعری کا جو وصف مجھے خاص طور پر پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جنابِ محروم کے پیشِ نظر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں، اور اُن کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔

ایک اور چیز جو اُن کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے، وہ کیفیتِ غم ہے۔ بہار ہو یا خزاں، قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر اُن کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے قدرت نے درد و گداز طبیعت میں حد سے زیادہ رکھا تھا۔ اس پر بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے کہ شاعر سراپا درد ہو گیا۔ ان صدموں میں سے سب سے زیادہ اثر اس جاں کاہ زمانے کا ہے، جب محروم کی جوان بیوی شادی کے چند سال بعد ایک ننھی سی لڑکی چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی۔ اس کو بستر مرگ پر دیکھ کر جو کچھ ان کے دل پر گذری، ننھی سی بیٹی کی بے بسی پر جو غم ہوا، اپنی خانہ ویرانی کا جو مسلسل نقشہ آنکھوں میں پھرا، یہ سب کیفیتیں نہایت درد بھرے لفظوں میں بیان ہوئی ہیں۔ اور اس حصے کا عنوان طوفانِ غم ہے۔ ان نظموں میں سے ایک میں سب دنیاوی رشتوں کی ناپائداری کا بیان کرتے ہوئے کوششِ صبر کے باوجود اپنی مجبوری

اشک باری کا ذکر ان شعروں میں کیا گیا ہے ؂

کتنے ہی اُستوار ہوں، ٹوٹیں گے ایک دن
رشتے یہ جتنے اُلفت دہر و وفا کے ہیں

محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم
جو کچھ ہیں جیتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

یہ درد اور اپنے نقصان کا احساس یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ کانٹے کی طرح ہر جگہ دل میں چبھتا رہتا ہے۔ شاعر کنارِ راوی پر بیٹھا ہے، قدرت اپنے دلچسپ نظارے دکھلا رہی ہے، مگر مغموم آنکھ اپنے غم کے سبب ان نظاروں کا لطف نہیں اُٹھا سکتی۔ چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے
جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے

گو اشارے کئے ہزاروں نے
آنکھ اُٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

"فصلِ بہار" پر نظم کہی ہے، بہار کی کیفیت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچ رہے ہیں، کہ یکایک اپنا غم یاد آجاتا ہے، اور نظم اس بند پر ختم ہوتی ہے ؂

آمدِ گل کا ہم کو کیا احساس
دل ہے پہلو میں کب سے کشتۂ یاس

یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس
ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک
برگِ گل اور نوکِ خار ہے ایک

محروم کی دردبھری طبیعت دوسروں کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہے —— انھوں نے اپنے بعض ہم عصروں کے بے وقت انتقال پر آنسو بہائے ہیں جن میں سچّی محبت اپنا جلوہ دکھارہی ہے۔ مولانا گرامی، طالب بنارسی، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، چکبست لکھنوی وہ حضرات تھے جن کے اشعار کلامِ محروم کے ساتھ ساتھ بارہا زینتِ اوراقِ مخزن ہوئے۔ محروم کو اُن سے غائبانہ انس تھا، مگر وائے محرومی کہ وہ یکے بعد دیگرے چل بسے۔ گرامی اور طالب تو خیر عمرِ طبعی کو پہنچ لئے تھے، گو اُن کے جانے سے شاعری کو نقصان پہنچا، مگر سرور، نادر اور چکبست جوانی میں اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اُن کی شاعری ابھی شباب پر تھی کہ وہ اپنے شمار مداحوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔

جو مثالیں اوپر درج ہوئیں، اُن سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاعر صرف تصویرِ غم کھینچنے ہی میں اُستاد ہے۔ قوّتِ سخن خوشی کے منظر دکھانے سے بھی قاصر نہیں۔ "ہلالِ عید" پر ایک دل کش نظم ہے۔ تمہید کا چُلبلا پن اور اسلوبِ بیان قابلِ داد ہے ؎

دیکھو، دیکھو، وہ میں نے دیکھ لیا — قُلّۂ کوہ سے ذرا اونچا
چُھپ گیا، چھپ گیا کہیں، دیکھو — پھر نظر آئے گا وہیں، دیکھو
وہ جو ہے سامنے شجر، دیکھو — اُس سے اوپر اُٹھا نظر دیکھو

اے لو، اے لو، وہیں نظر آیا
مژدہ اے شائقیں، نظر آیا

بندرابن میں صبح ہو رہی ہے، اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ مناظرِ قدرت سے شاعر کی دلچسپی اور ان کی تصویر سہل مگر رنگین الفاظ میں کھینچنا قابلِ توجہ ہے ؎

صبحِ خنداں، عروسِ تازہ — آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی — شانوں پہ کاکلیں طلائی
چہرہ اس کا وہ یعنی خورشید — بے پردہ، عدوّ حسرتِ دید
ہر چیز کو پرتوِ سحر سے — قدرت نے رنگا ہے زنگ زر سے

جمنا ابھی خواب سے اٹھی ہے
پیدا بشرے سے تازگی ہے

طبع زاد نظموں کے علاوہ مرحوم کی ہمہ گیر طبیعت نے چمنِ اردو کی آرائش کے لئے ہر باغ سے پھول لئے ہیں۔ انگریزی میں شیکسپیئر کے ڈراموں سے بعض دلچسپ اشعار ترجمے کے لئے انتخاب کئے ہیں، اور اُن کو اُردو کا لباس ایسی خوبی سے پہنایا ہے، کہ اُن میں سے کوئی پہچانتے نہیں جاتے کہ اصل میں یہ انگریزی نژاد ہیں۔ مثلاً شبنم کے متعلق دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہی شبنم جو غنچے پر مثالِ گوہرِ غلطاں — نظر آتی تھی اِترائی ہوئی خود اپنی قسمت پر

کوئی ہوا شگفتہ یزداں جس طرح اپنی ندامت پر
بہ رنگِ اشک، چشمِ شاہدِ گل میں نمایاں ہے

چند صفحے "سیرِ گلستاں" کے زیرِ عنوان ایسے ہیں جن میں حضرت سعدیؒ شیرازی کی "گلستاں" سے پند آمیز اشعار کا سادہ ترجمہ آسان اُردو میں کر دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے ؎

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب
اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہہ دیں کہ نہ آؤ

ایک اور شعر سعدی کا ہے جو بے تکلف اُردو کے سانچے میں ڈھل گیا ہے ؎

پیچھے جو تجھ کو چھوڑ چلا، وہ شخص ترا ہمراہ نہیں
مت اُس سے لگا تو دل اپنا جس شخص کو تیری چاہ نہیں

محروم نے چونکہ عمر بھر محکمۂ تعلیم میں بسر کی ہے، خود اُن کے کلام میں بہت سے حصے جوانوں اور بچوں کے لئے نصیحت آمیز ہیں۔ آج کل نقادانِ فن کا میلان اس رائے کی طرف ہے کہ نصیحت آمیز شاعری اصلی معنوں میں شاعری نہیں ہوتی، ان کے نزدیک شاعری جذبات کے طوفانِ بے پایاں کا نام ہے، یا تخیل کی نزاکتوں اور معنی آفرینیوں کا۔ البتہ اگر کوئی اُستاد معمولی مضامین میں بھی اپنی سحر آفرینی سے رنگ بھرے تو وہ پند آمیز کلام کا رتبہ بلند کر دیتا ہے۔ محروم جا بجا اس فن میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پندِ رنگیں کا نمونہ دیکھنا ہو تو ایک نظم دیکھئے، جس میں شراب کی مذمت کی گئی ہے۔ شراب کی تعریف میں تو بہت سی

رنگین شاعری ہو چکی ہے، اب مذمت شراب میں محروم کی طبیعت کا رنگ دیکھئے ؎

فریب دہر نے تدبیر جاں ستانی کی | کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
نہ خور ہے نہ یہ کھائی پری ہے شیشے میں | رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

ایک نظم "استاد" کے عنوان سے لکھی ہے، اس کے دو شعر قابلِ ملاحظہ ہیں، ایک میں کس سچائی سے تعلیم کی صحیح تعریف بیان کی گئی ہے۔ دوسرے میں واقعاتِ حاضرہ پر دو مصرعوں کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے ؎

نہاں ہیں فطرتِ انساں میں جو ہر عالی | ہنر سے اپنے ہے کرتا انھیں عیاں استاد
دلوں کی ہوتی تھی تعلیم فیضِ دل سے کبھی | زباں ہی آج تو شاگرد ہے، زباں استاد

میں نے چند نظموں کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کی رنگا رنگی اصل مجموعے میں نظر آئے گی جس میں ہر مذاق کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ مہاتما بدھ ایوانِ شاہی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ سین بہت خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔ رامائن سے ایک سین لیا ہے، اور رام چندر جی کے بن باس کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ رباعیات ہیں، قطعات ہیں، تصوف اور معرفت کا رنگ بھی موجود ہے۔ اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ قدرت کے گوناگوں نظاروں سے کس طرح اپنے فطرتی وجدان کو بڑھاتی ہے ؎

(۱)

چمن میں، دشت میں، وادی میں، کوہ و صحرا میں | گہر میں، اولے میں، شبنم میں، ابر و دریا میں

شرر میں، شعلے میں، آتش میں، برقِ سینا میں
شمیمِ گُل میں نسیمِ مسرت افزا میں
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

(۲)

آبشاروں کا ترنم ترے بہلانے کو
لالہ زاروں کا تبسم ترے بہلانے کو
دن کو ہنگامۂ مردم ترے بہلانے کو
رات کو محفلِ انجم ترے بہلانے کو
تجھ کو دی تابِ تکلّم ترے بہلانے کو
اب بھی شاداں نہ ہوا ے دل تو خطا کس کی ہے؟

اِس تقریب کو ختم کرنے سے پہلے میں دو باتیں خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ جناب محروم اُن ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے، جس سے دونوں کو فائدہ اُٹھانے کا حق ہے، اور جس کی خدمت دونوں کے ذمّے ہے۔ خدا کرے کہ آپ دیر تک اُردو کی خدمت کے لیے زندہ سلامت رہیں۔ دوسری بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ہم اس امر پر فخر کر سکتے ہیں کہ محروم کا زادبوم سرزمین پنجاب ہے۔ میں نے جب تک اُنھیں دیکھا نہ تھا، اور خط و کتابت کے ذریعے اُنھیں جانتا تھا تو اُن کے کلام سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صوبجات متحدہ کے کسی حصے کے رہنے والے ہیں۔ جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ پنجاب کے اُس گوشے سے

رہنے والے ہیں جہاں اُردو کا چرچا بہت کم ہے۔ ضلع میانوالی آپ کا مسکن ہے،
اس جنگل میں خدا نے وہ خودرو پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی۔
جناب محروم کے کلام کے متعلق حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے یہ رباعی لکھ کر اُن کی
طباعی کی تعریف کی تھی ؎

لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
اُن کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز

محروم نے اس داد کا شکریہ ایک رباعی میں ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
طبعِ موزوں خدائے برتر سے ملی
جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں

میں نے شملے کے مشاعرے میں، اور اس کے بعد لاہور کے بعض مشاعروں
میں جناب محروم کو پڑھتے سُنا ہے۔ اُن کا لہجہ سرحدی علاقے کا لہجہ ہے۔ گو اُن کا
پڑھنا ایک خاص انداز رکھتا ہے۔ مگر اُسے سُن کر اُن کی صفائی زبان پر اور بھی
تعجب ہوتا ہے اور اُن کی کوشش اور کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔

لاہور
۱۹۳۷ء

رُباعیاتِ محروم

برج موہن دتاتریہ کیفی

رباعی ایسی صنف ہے، جو تخیّل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے، اسی وجہ سے عموماً اس کی طرف کم توجّہ ہوتی ہے۔ یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے رباعیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں ایسے اور اتنے مجموعے اُردو میں نہیں نظر آتے۔ لیکن کہنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ فارسی اور اردو کی عمروں میں کتنا فرق ہے۔ پھر بھی اُردو نظم کا ذخیرہ رباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔ میر انیس نے بہت رباعیاں کہیں، اور ایسی کہیں کہ رباعی کہنے کا حق ادا کیا۔ ان کے ہاں اکثر چوتھا مصرع رباعی کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ حالی مطلب سے مطلب

رکھتے تھے۔ اُن کی رُباعیاں اُن کے اصلاحی مفہوم کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر اپنے رنگ میں چھ کھے ہیں۔ رباعیوں کے دو اور مجموعے اس صدی میں شائع ہوئے ہیں، جو بہت قابلِ قدر ہیں۔ ایک کے مصنف رواں لکھنوی ہیں، اور دوسرے کے اثر صہبائی۔ ان کے ہاں شباب کے دلولے، جذبات کی بیتابی کے ساتھ حسنِ ادا اور خیالات کی بلندی بھی موجود ہے۔ اب جناب محروم کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہوتا ہے۔

محروم صاحب دنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اُردو اور فارسی کی دُنیا میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں جس کی وقعت اور عظمت سب کو تسلیم ہے۔ آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیل بلند و مستحکم اور بیان دل کش ہے۔ آپ کا شمار اُن اساتذہ میں ہے جن کی غائر نظر حال اور مستقبل تک پہنچتی ہے۔ آپ کے کلام کی شیفتگی اور اسلوب کی دل آویزی ملک کے نقّادوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ آپ کی ذہنیت توازن اور آپ کا شعور اعتدال سے مزین ہیں۔ جن اوصاف اور اقدار کی رباعی کے لئے ضرورت ہے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اور کلام کی طرح رباعیاں بھی نہایت پسند کی جاتی ہیں۔ آپ کا مجموعۂ رُباعیات کا یہ دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ اُردو کو یہ اضافہ مبارک ہو۔

بلند آہنگی اور لفظی گورکھ دھندے سے آپ ہمیشہ دُور دُور رہے۔ چنانچہ ان کا نشان آپ کی رُباعیوں میں کہیں نہیں ملے گا۔ وقتِ نظر اور معنویت کی آنچ کے

ہاں کمی نہیں۔ چند رباعیاں اِدھر اُدھر سے اُٹھا کر یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

بندگی کے احساس کے ساتھ جذبۂ خودی کے تیور ملاحظہ ہوں:۔

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے ۔۔۔ یہ ڈوب گئے ہیں پار اُترنے والے
بے خوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا ۔۔۔ کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

آج کل کے تمدن میں انسان جس حالت کو پہنچا ہے اُس کا نقشہ کس صفائی اور سچائی سے کھینچا ہے۔

حاصل کتنا کمال انسان نے کیا ۔۔۔ افلاک کو پائمال انساں نے کیا!
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں ۔۔۔ انساں کو تباہ حال انساں نے کیا؟

اور

بے رحم و کرم ہے آج بیزار انساں ۔۔۔ انساں سے ہے خود برسرِ پیکار انساں
دنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے ۔۔۔ کس منہ سے ہے جنت کا طلبگار انساں

اخلاقِ احسن کے باب میں کیا خوب کہا ہے:۔

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف ۔۔۔ کر دے اہلِ دیا کے کینوں کو معاف
دنیا میں کسی سے کر نہ بے انصافی ۔۔۔ دُنیا سے مگر نہ رکھ اُمیدِ انصاف

دُنیا کو اس کی خرابیوں کی وجہ سے بُرا نہیں کہا بلکہ اور کسی کو ملزم ٹھہرایا ہے۔

دنیا کتنی ہی صدق و صفا کی دنیا ۔۔۔ رحم و کرم و مہر و وفا کی دُنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو ۔۔۔ جور و ستم و کذب و ریا کی دُنیا

فکر و نظر کی وسعتیں ملاحظہ ہوں۔

کھلتا یہ راز علم و حکمت پہ نہیں | جب تک کرم خاص بصارت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار | پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

تقدیر کا رونا کون نہیں روتا مگر آپ کا نقطۂ نظر عالمانہ ہے۔

کیوں سب کو سنائیں حالِ ابتر اپنا | جب اس میں قصور ہو سراسر اپنا
ہم کوستے ہیں عبث مقدر کو ندیم | اعمال سے بنتا ہے مقدر اپنا

اور

پاداشِ عمل کی ہے یہ منزل اے دوست | قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست
اعمالِ بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم | قدرت ان سے نہیں ہے غافل اے دوست

جبر و اختیار بہت پامال مسئلہ ہے۔ آپ نے اس میں ندرت کا رنگ چمکایا ہے۔

مختار تھا، کر گیا جو دل کو بھایا | ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا | یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا

مذہب کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام | حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی؟ | مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے جو بدعنوانیاں ہماری تہذیب و تمدن میں

داخل ہونے لگیں۔ ان کی شکایت اس طرح کرتے ہیں۔

تغیر پسند ہے زمانے کا مزاج — تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش — برہم زنِ ہوش حسنِ عریاں ہے آج

یہ مانتے ہیں کہ:

اس دورِ کمالات میں پسپا ہوں میں — نقشِ قدمِ قدیم کا جویا ہوں میں
سائنس کی تم ترقیاں گنواؤ — انسان کی مصیبتوں کو گنتا ہوں میں

محرومؔ صاحب نرے زاہدِ خشک نہیں ہیں، کس تڑپ کے ساتھ کہتے ہیں،

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں — ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد ہیں گزری ہوئی برساتوں کی — آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں

کوئی یہ نہ سمجھے کہ محرومؔ صاحب "ادب برائے زندگی" کے قائل نہیں۔ یہ

دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی! — مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی
مصنوعی ہیں زندگی کے سارے ساماں — کیوں کر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی

اور:

ہرگز نہیں دور بیں نگاہِ انساں — روشن تقدیر ہے راہِ انساں
تقدیر نے گندم کو کیا ہے کم یاب — گندم تھی باعثِ گناہِ انساں

آخر میں یہ کہنا ہے کہ دنیا میں معاشرے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، ادب

کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ لوگوں کے ذوق اور پسند بھی بدلتے رہتے ہیں، لیکن ادب کے وہ کارنامے جو جان دار ہوں اور شعور کی سچائی کا جوہر رکھتے ہوں اُن کی قدر اور وقعت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ لوگ شاعر کو بھول جاتے ہیں، مگر اس کے شعر گنگناتے رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ صحیح مذاقِ سخن رکھنے والے محروم صاحب کے ادبی کارناموں سے ہمیشہ مستفید رہیں گے، اور اُردو نظم میں اس اضافے کو مبارک سمجھا جائے گا۔

دہلی ۱۴۔ اگست ۱۹۴۹ء

رُباعیاتِ محروم

محمد اقبال پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور

فارسی شاعری میں رباعی بہت پُرانی چیز ہے، عروضیوں نے تو اس کی بحر کو عربی اوزان سے نکالا ہے، لیکن جدید تحقیقات نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا ہے کہ رباعی کا وزن اسلامی زمانے سے پہلے کا ہے، اس عقیدے کو کوئی مانے یا نہ مانے بہر حال یہ مسلّم ہے کہ رُباعی خالص ایرانی چیز ہے، اور وہ ایران ہی میں پیدا ہوئی، اور وہیں اُس نے پرورش پائی، اس کا نام اگرچہ عربی نام ہے لیکن یہ نام اسے بہت بعد کے زمانے میں دیا گیا۔

تیسری چوتھی صدی ہجری کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی کو اس زمانے میں ترانہ کہتے تھے، اور بالعموم اسے گانے کے لئے تصنیف کیا جاتا تھا، جیسے آج کل

ٹھمری یا گیت۔ موسیقی میں وہ بہت مقبول چیز تھی، لیکن فارسی شاعری میں رفتہ رفتہ
اس میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی کہ قصیدہ اور مثنوی تو درکنار، غزل
بھی اس کے سامنے ناچیز ہو کر رہ گئی، مدح و ذم، عشق و تصوّف، مذہب و
اخلاق اور پند و نصائح کے مضامین جس خوش اسلوبی، دلفریبی اور اختصار
کے ساتھ فارسی رباعی میں ادا ہوئے ہیں وہ کسی دوسری شکل میں ادا نہیں
ہو سکے۔

اُردو میں اگرچہ شاعری کے دوسرے شعبوں نے بے انتہا ترقی کی، لیکن
رُباعی کو وہ رُتبہ نصیب نہ ہوا جو اُسے فارسی میں حاصل تھا، فارسی میں بیسیوں
ایسے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے محض رُباعی گوئی کی بدولت لازوال شہرت
حاصل کی۔ شیخ ابوسعید، خیّام، افضل کاشانی، سحابی اور سرمد کی عالمگیر شہرت
صرف رُباعی کی بناء پر ہے۔ لیکن اُردو میں کسی ایسے شاعر کا نام نہیں لیا جاسکتا، اور
جہاں تک مجھے علم ہے مولانا حالؔی اور اکبرؔ الہ آبادی کے سوا کسی اور اُردو شاعر کا
مجموعۂ رباعیات شائع ہو کر مقبول عام نہیں ہوا۔

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ اب رباعیاتِ محرومؔ کی اشاعت سے اُردو شاعری
اور خصوصاً اُردو رباعیوں کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ ہو رہا ہے۔ جناب
محرومؔ کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا شمار اب ملک کے نامور اساتذۂ سخن میں ہے۔
اُن کے کلام کی پختگی اور زبان کی دلآویزی اُردو ادب کے ہر شیدائی سے خراجِ تحسین

وصول کر چکی ہے۔ محروم کا نام ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ ان کا یہ جدید مجموعہ رباعیات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کی چیز ہے۔

رباعیاتِ محروم کا شاعرانہ معیار بہت بلند ہے۔ فلسفۂ اخلاق، مذہب اور روحانیت کے وہ نکتے جنھوں نے فارسی رباعیوں کو اس قدر پُرمعنی بنایا، ان میں جا بجا ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دروازہ نجات کا بیاباں میں نہیں
دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکیں جنّت میں بھی نہیں مل سکتی
جب تک موجود قلبِ انساں میں نہیں

•

دُنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے
ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے
اِس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

•

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے
حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اُس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن
الزامِ گناہ سے بہت ڈرتا ہے

•

انکارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
تکرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
حاصل ہو ثوابِ مفت اس لالچ میں
اقرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں

•

ظاہر میں قضا بہت ستم ڈھاتی ہے
جاں سن کے اجل کا نام ڈر جاتی ہے
لیکن ہر موت کا نتیجہ ہے حیات
ہر شام پیامِ صبحِ نو لاتی ہے

•

بدخواہ نہیں خالقِ اکبر اپنا
غائب ہو کر بھی ہے وہ رہبر اپنا
ہم خود ہیں برے تو ہے مقدر بھی برا
اچھے ہیں تو اچھا ہے مقدّر اپنا

•

ادبار کا گھر، کہ جائے اقبال ہے دہر
جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پہ ہے برہم اتنا
ناداں ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

•

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف
کر دے اہلِ ریا کے کینوں کو معاف
دنیا میں نہ کر کسی سے بے انصافی
دنیا سے مگر نہ رکھ امیدِ انصاف

محروم کو اپنی زندگی میں بہت سے جانکاہ صدمے دیکھنے پڑے ہیں، جن کی بدولت اظہارِ یاس والم ان کے کلام کا ممتاز جوہر بن گیا ہے، رباعیات میں بھی بعض جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

درکار جگر تھا زخمِ کاری کے لئے
تیّار نہ تھا جگر فگاری کے لئے
محروم! خوش اس کو کس طرح میں رکھتا
جو عمر ملی تھی سوگواری کے لئے

•

حیران ہوں کیا کیا خدایا میں نے
بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے
پیری بھی قریبِ خاتمہ آ پہنچی
منزل کا نشاں ابھی نہ پایا میں نے

•

کب کوئی جہاں میں چھوٹتا ہے غم سے
دل آخر کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بشر کی آنکھیں
پھوڑا غفلت کا پھوٹتا ہے غم سے

محروم کی رباعیاں اُن کی ادھیڑ عمر کا کلام ہیں، اس لئے ان میں عشقیہ یا ظریفانہ عنصر موجود نہیں ہے، اس کے علاوہ انھوں نے نئی تہذیب خصوصاً فرقہ نسواں کی بے حجابی اور بے باکی پر نفرین کی ہے، لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ نوجوان طبقے کے لئے ان کے خیالات قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ صرف وقت کی تاثیر ہے، اخلاق اور حکمتِ عملی کی جو صداقتیں انھوں نے بیان کی ہیں خواہ کسی کو اچھی لگیں یا نہ لگیں، لیکن آخر پھر کر وہی انسانی زندگی کا دستور العمل بنتی ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ جنابِ محروم کی رُباعیاں اُن کے دوسرے کلام کی طرح بہت جلد دلوں کو مسخر کریں گی۔

اورنٹیل کالج لاہور

۲۵- اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

ایک انسان۔ ایک فن کار

تاجور سامری

محروم صاحب کا نام تو میں اُسی زمانے سے جاننے لگا تھا، جن دنوں ہائی سکول کے پانچویں چھٹے درجے میں پڑھتا تھا۔ بعد میں بعض رسالوں یا اُن کی کتاب "گنج معانی" میں چھپی ہوئی تصویروں کی بدولت اُن کی شبیہہ سے بھی آشنائی ہوگئی، مگر باقاعدہ ملاقات اتنے لمبے زمانے کے بعد ہوئی کہ میں اُن سے ملنے کی تمام اُمیدیں چھوڑ چکا تھا۔ وہ راولپنڈی میں تھے اور میں لائل پور میں۔ پنجاب کے دو مختلف کونے۔ یوں بھی میل مشکل تھا۔ لیکن لاہور ایک ایسا مقام تھا جہاں ایسی صورت ممکن تھی، اور یہیں آخر میں اُن کی عظیم شخصیت کی پہلی جھلک میسّر آئی۔

میری ادبی زندگی بہت جلد شروع ہوگئی تھی۔ والد صاحب پنجابی میں شعر

کہتے تھے۔ اس ماحول نے مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگنا شروع کیا، چنانچہ سب سے پہلے جس شاعر سے میں متاثر ہوا وہ محروم صاحب تھے۔ اُن کی شاعری نے میرے شعور کے ارتقا کے ساتھ اپنی ایک خوشگوار گونج میرے ذہن میں پیدا کردی تھی۔ اُن کی بہت سی نظمیں اور غزلوں کے شعر اس فضا میں بہار کے پرندوں کی طرح چہچہانے لگے تھے۔ یہ گونج دھیرے دھیرے گہری اور واضح ہوتی گئی حتیٰ کہ میں محروم صاحب کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت اور صورت سے بھی عقیدت رکھنے لگا تھا۔ یہی کارن تھا میں اُن سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ عقیدت اتنی گہری چھاپ میرے دل و دماغ پر ڈالنے لگی کہ میں اپنے نام کے ساتھ خاک پائے محروم لکھنا باعثِ فخر سمجھنے لگا تھا۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اُن سے ملنے کی کوشش میں اور سلسلہ خط و کتابت جاری کرنے میں شوق نے مجھے دیوانہ سا کردیا تھا۔ جہاں کہیں کسی ایسے شخص کا نام سُن پاتا کہ وہ محروم صاحب کو جانتا ہے تو میں فوراً وہاں پہنچتا، مگر رسائی فی الحال ممکن نہ تھی۔ اتفاق سے اُن کے ایک شاگرد پنڈت پرمانند بالی لائل پور گورنمنٹ گرلز کالج میں ہیڈ کلرک ہو کر تشریف لائے۔ اُن سے اس شوق نے مزید ترقی کی۔ اُن کے ایما سے میں نے پہلی بار اپنی دو ایک نظمیں ایک شاعر جناب عاصی کے توسط سے محروم صاحب کی خدمت میں روانہ کیں۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ میرے خط کا جواب آئے گا، لیکن ایک دن عاصی صاحب نے اُن کا خط لاکر میرے حوالے کیا۔ یہ لفافے کی شکل میں تھا۔ مجھے گویا قارون کا

خزانہ مل گیا تھا۔ خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے، جگہ جگہ دوستوں اور ملنے والوں کو خط دکھاتا اور اپنی اہمیت جتاتا تھا۔ اگرچہ اُن کا خط حوصلہ افزا نہ تھا، اور نظموں پر اصلاح بھی معمولی اور لفظی تبدیلی کی صورت ہی میں تھی لیکن محروم صاحب کا خط لکھ دینا کوئی معمولی بات تھوڑا ہی تھی۔ اُن کے خط کی اصلی میرے پاس اِس وقت نہیں، مگر عبارت اور مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

عزیزی!

نظمیں دیکھ کر واپس بھیج رہا ہوں۔ آپ پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کی طرف رجوع کیجیے، وہ اس فن کے استاد ہیں۔ میں عروض نہیں جانتا۔ بہتر ہوگا اگر آپ پنجابی میں فکرِ سخن کریں۔ اپنے مذاقِ سلیم کو رہنما بنائیں۔ پھر کسی استاد کی آپ کو ضرورت نہیں ہوگی۔

تلوک چند محروم

کچھ زمانے تک میں محروم صاحب کے خط کو محض اظہارِ انکسار سمجھتا رہا، اور دو ایک خط اور لکھے، مگر انھوں نے قطعاً جواب نہیں دیا، اور میں نے مایوس ہو کر اور محنت اور توجہ سے مطالعہ اور مشقِ سخن شروع کر دی۔ اب میرا کلام اخباروں اور معیاری رسالوں میں بھی چھپنے لگا تھا، اور میں مشورۂ سخن کے لیے پنڈت ونا اور علامہ کیفی سے ہو کر پنڈت جوش ملسیانی تک پہنچ چکا تھا۔ مگر محروم صاحب سے جو دلی عقیدت تھی وہ بدستور قائم تھی،

گو وہ شدّت نہیں رہی تھی، ایک دفعہ جب علامہ کیفی نے ایک صحبت میں سوال کیا تھیں کون سا شاعر پسند ہے تو میں نے بے جھجک جواب دیا تھا: تلوک چند محروم۔ انھوں نے فرمایا تھا تو اُن کا کلام زیرِ مطالعہ رکھو اور ان کا رنگ اپناؤ۔

میں نے اُن کا کلام بہ غور اور بہ شوق سنا، یہ دوسری بات ہے کہ اُن کا رنگ میری طبیعت قبول نہیں کر سکی۔ اور یہ کوئی ضروری امر بھی نہیں تھا۔ گو شروع شروع میں میری چند نظمیں اُن کی بعض نظموں کی صدائے بازگشت سی تھیں۔ مگر بہت جلد میں نے اپنا بُرا بھلا رنگ اختیار کیا۔

اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے غم اور خلوص، اور یہی مجھے پسند ہے۔ اُنھوں نے بیشتر جو کچھ فرمایا وہ اسی رنگ میں، اسی خلوص میں ڈوب کر کہا۔ اسی کارن اُن کا کلام سب شاعروں سے الگ اور نرالا ہے۔ شاید درگا سہائے سرور مرحوم کا اس سلسلے میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مگر میری رائے میں اُن کا رنگ اور ہے، اور کلامِ محروم کا رنگ اور۔ اُس زمانے میں جب میں اُن کا کلام اشتیاق سے پڑھتا تھا مجھے اُن کے رنگِ سخن سے اتنی قربت ہو گئی تھی کہ اخبارات و رسائل میں ان کی بعض گمنام نظمیں بھی میں نے پہچان لی تھیں۔ کیوں کہ اُن نظموں کے مصرعوں کی شباہت اُن کی مشہور نظموں سے ملتی جلتی تھی۔

مخدوم صاحب نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں، اور اسی صنف میں اُن کا مخصوص رنگ اور اسلوب اپنی بہار دکھاتا ہے۔ لیکن دوسرے شعرا کی طرح انھوں نے بھی شروع میں غزلیں کہی ہیں۔ میرے سامنے اُن کے مجموعۂ کلام "گنجِ معانی" کا دوسرا ایڈیشن ہے، جس کے آخر میں اُن کی شروع کی غزلوں کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اکثر رسالوں میں اُن کی غزلیں میری نظر سے گزرتی رہی ہیں۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی غزلوں کا انداز بھی اپنا ہی ہے۔ اُن کی آواز بے شمار غزل گو شعرا میں الگ اور خوشگوار ہے، اور فوراً پہچانی جا سکتی ہے۔ ذیل میں اُن کی صہبائے غزل سے چند جرعے نوش فرمائیے۔

کاوشوں سے اماں ملے نہ ملے	پھر ترا آستاں ملے نہ ملے
اب قفس ہی کو آشیاں کہیے	راحتِ آشیاں ملے نہ ملے
دل سے کہتے ہیں مشورے دن رات	ہم سخن، ہم زباں ملے نہ ملے
محوِ فریاد ہم ہیں آج کہ پھر	فرصتِ یک فغاں ملے نہ ملے
عَلَمِ آہ سربلند ہے آج	کل ہمارا نشاں ملے نہ ملے
تُو تو بیتاب ہے مگر اے دل	ہو گئے وہ جہاں ملے نہ ملے

زوالِ حسن کو حسنِ نگار کیا جانے	خزاں قدم بہ قدم ہے بہار کیا جانے

کہاں یہ شامِ غریباں کہاں وہ صبحِ وطن
یہ فرقِ گردشِ لیل و نہار کیا جانے

جو پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں راہِ منزل میں
وہ کب اُٹھیں گے کوئی شہسوار کیا جانے

ایک ہم ہیں اپنے گلشن کو جو صحرا کر چکے
ایک وہ ہیں دشت میں جو گلستاں پیدا کریں

آدمیت کو نہ چھوڑیں یہ ہم غنیمت ہے یہی
کون کہتا ہے صفاتِ قدسیاں پیدا کریں

اس میں ہائے معمارِ ہستی مصلحت تھی کون سی
ایسا قصرِ خوشنما اور ریت کی بنیاد پر

غزالِ فسرگی کس کی ہے کوئی کیا سمجھے
بہار کس کا تبسم ہے کوئی کیا جانے

یہ تو مخدوم صاحب کی غزل سرائی کے نمونے تھے۔ ان کی نظم تو اپنا جواب نہیں رکھتی۔ خاص طور سے نغمگی کے ساتھ ساتھ احساسِ غم کی نرم آنچ جو اُن کی شاعری میں ایک ایسی تابناکی اور گہرائی پیدا کرتی ہے جس کی مدتِ غم کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ آج کا زمانہ ہے سائنس اور مشین کا زمانہ، اور اتنا تیز رفتار ہے کہ اس کا ساتھ دینا ہر شخص کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شاعری نے بھی اپنا مزاج اور روپ بہت کچھ بدل لیا ہے۔ نئے تقاضوں سے سوچنے اور محسوس کرنے کی قدروں میں یکسر انقلاب آچکا ہے۔ بیشک مخدوم صاحب نے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ لیکن اُن کی وہ غیر فانی نظمیں جو آج کے تقاضوں اور

محسوسات سے بہت قریب ہیں، آج بھی کرۂ ادب و شعر پر حاوی ہیں۔ نور جہاں کا مزار، بادِ بہاری چلی، بچے کی مسکراہٹ، شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے جیسی نظمیں آج بھی بہترین شاعری میں گنی جاتی ہیں۔ محروم صاحب نے ایک طویل عمر پائی ہے" اور زمانے کا اُتار چڑھاؤ بہت دیکھا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری کا حجم بھی بہت بڑا ہے۔ اُن کا بہت سا کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ اس لئے اُن کے کلام پر حکم آخر نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ محروم صاحب کا نام شاعری کی دنیا میں امر رہے گا۔

جب میرا کلام اخباروں، رسالوں میں چھپنا شروع ہوا اور مختلف ادیبوں اور شاعروں سے تعارف ہوا تو اسی سلسلے میں محروم صاحب کے فرزندِ رشید جگن ناتھ آزاد سے بھی ملاقات ہو گئی۔ شروع ہی میں اُن کے خلوص نے اپنی طرف مجھے کھینچنا شروع کیا، حتیٰ کہ ملاقات مستقل دوستی میں بدل گئی۔ یہ ملاقات محروم صاحب تک رسائی کا پہلا زینہ تھی۔

غالباً وہ نومبر کی گہری شام تھی، آزاد صاحب مجھے اپنے ساتھ محلہ رام نگر (لاہور) اپنے ہاں لے گئے تھے اور بیٹھک میں بٹھا کر زنانے میں تشریف لے گئے۔ دونوں وقت مل رہے تھے، اتنی روشنی تھی کہ ملنے والے کی دھندلی سی صورت دکھائی دے سکے۔ میں اپنے دل میں محروم صاحب سے ملنے کے اشتیاق کا طوفان لئے بیٹھا تھا، اور میرا دل سمٹ کر میری آنکھوں میں آگیا تھا، آزاد صاحب کے جانے اور محروم صاحب کے

آنے میں مشکل سے پانچ منٹ کا وقفہ ہوگا، مگر مجھے ایسا لگا جیسے برس گزر گیا ہو،
اچانک میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری آنکھوں نے دیکھا اس دھندلے سے کمرے
میں محروم صاحب اپنی دراز قامت اور بارعب شخصیت کے ساتھ جلوہ فرما تھے۔ میں
اُٹھا اور اُن کے پاؤں کی طرف جھکا، اُنھوں نے فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے اور ایسے
لہجے میں فرمایا 'یہ آپ کیا کرتے ہیں؟' جیسے اُن سے کوئی خطا ہوگئی ہو۔ اُنھوں نے
ایک کرسی پر بٹھایا، اور خود بھی میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں ٹیبل لمپ
جل گیا تھا۔ مگر ہم خاموش بیٹھے تھے۔ جب تک وہ میرے سامنے نہ تھے میں سوچتا تھا
ملوں گا تو یہ کہوں گا، یہ کہوں گا۔ مگر سامنا ہوا تو وہ سارا پروگرام ریت کے محل کی
طرح دھڑام سے زمین پر آپڑا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس وقت میں نے کچھ کہا بھی کہ
نہیں۔ محروم صاحب بھی خاموش رہے۔ آزاد صاحب بھی اس بیچ میں میرے لئے کھانے
پینے کا سامان لے کر آگئے تھے۔ مگر بات کوئی نہیں ہوئی حتّٰی کہ یہ ملاقات اسی خاموشی
میں ختم ہوئی، اور میں وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد مجھے اپنی بے بسی پر بہت غصہ آیا،
اور ارادہ کیا کہ اب کی ملنا ہو تو اس کی تلافی کروں گا۔ مگر دوبارہ ملاقات اُس وقت
ہوئی جب ملک تقسیم ہو چکا تھا، اور ہم لاکھوں انسانوں کی طرح بے گھر ہو چکے تھے۔

وطن سے اُکھڑ کر میں سال بھر تک ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھ سکا۔ کبھی جالندھر
کبھی دہلی، کبھی الٰہ آباد، کبھی امرتسر۔ اس دوران میں اخباروں کے ذریعے سے
محروم صاحب کی خیر و عافیت اور مصروفیتیں معلوم ہوتی رہیں۔ جن دنوں وہ عارضی

طور سے جالندھر میں مقیم تھے میں بھی دو دن کے لیے وہاں تھا۔ روزنامہ "ہند" کے ایڈیٹر دینا ناتھ ورما سے پتا چلا کہ وہ دہلی اُٹھ جانے والے ہیں۔ ورما صاحب نے وعدہ کیا کہ میں آپ کو اپنے ساتھ اُن کے ہاں لے چلوں گا۔ مگر اسی شام کو مجھے امرتسر ایک ضروری کام سے لوٹ جانا پڑا اور یہ امکانِ ملاقات ختم ہو گیا۔

۱۹۵۳ء سے جب میں مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گیا تو محروم صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اب لاہور والی بات نہ تھی۔ ہم دونوں پہلی ہی ملاقات میں اتنے قریب آ گئے تھے کہ خوب باتیں ہونے لگی تھیں۔ لاہور میں جب میں نے اُن کو دیکھا تھا تو وہ اتنے بوڑھے نہیں تھے۔ لیکن اب اُن میں بڑھاپے کے سب آثار موجود ہیں۔ سر کے بالوں میں سفیدی نمایاں ہو گئی ہے، اور جسم دُبلا اور کچھ نقاہت لئے ہوئے ہے۔ لیکن اُن کی شخصیت کے وہ اجزا جو مجھے عزیز تھے اب بھی پوری شان سے اُن میں موجود ہیں۔ وہی بچوں کی سی مخصوص سادگی لیے ہوئے بزرگی، خلوص اور سچائی سے چمکتی ہوئی آنکھیں اور مسکراتا سا چہرہ۔ وہ ہندوستانی بھی بولتے ہیں، اُن کا لہجہ ابھی تک اپنے وطن میانوالی کا سا ہے۔ مگر وہ بے مطلب اور بے کار لفظ استعمال نہیں کرتے۔ باتوں کا انداز جچا تُلا مکمل، اور جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اُن کی زبانی اُن کا کلام ابھی تک نہیں سن پایا۔ اور یہ حسرت ابھی تک تشنہ ہی ہے۔ لیکن باتوں میں ہم ہر طرح کے موضوع پر بے تکلف تبادلۂ خیالات کر لیتے ہیں۔ اُن کی تنقیدی نگاہ بھی بہت گہری ہے کسی بات پر اپنی

رائے ظاہر کرتے ہوئے بہت ہچکچاتے ہیں۔ لیکن جب کہتے ہیں تو کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ہم عصر شعراء کے متعلق اُن کا رویہ دوستانہ ہے۔ اوروں کی طرح بے وجہ دوسروں کی عیب جوئی نہیں کرتے۔ بہت مرنجان مرنج قسم کی طبیعت پائی ہے، اور سب سے بڑی بات جو اُن میں اب بھی نمایاں ہے، وہ یہ ہے کہ زندگی اور انسان کی ترقیوں اور خوش حالیوں سے وہ بے انتہا محبت کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو اب بھی نامکمل سمجھتے ہوئے اور بڑھنے اور ترقی کرنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس نے میرے دل میں محروم صاحب کی عقیدت اور محبت کی جڑیں بہت گہری کردی ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے زمانوں کی کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے۔

دہلی

جون ۱۹۵۶ء

گنجِ معانی

جوش ملسیانی

منشی تلوک چند محروم کی مقبولِ عام نظموں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پیشتر بھی اُن کا کلام تین جلدوں میں (کلامِ محروم حصّہ اوّل، حصّہ دوم، حصّہ سوم) اشاعت پذیر ہو کر مقبولِ عام ہو چکا ہے۔ مگر ان ہر سہ حصص میں نظمیں اور غزلیات دونوں قسم کا کلام شامل تھا۔ اب اُنھوں نے حصّۂ غزلیات کو علیحدہ کر کے کچھ سابقہ نظمیں اور بہت سی جدید نظمیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں[1]۔

---

[1] اس وقت قطعی صورت یہ ہے کہ گنجِ معانی کے دوسرے ایڈیشن میں ابتدائی غزلیں شامل کر دی گئی ہیں۔ بعد کی غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ سیاسی نظموں کا مجموعہ زیرِ طباعت ہے اور رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ (ج - ن - ا)

اور اس مجموعے کا نام "گنجِ معانی" تجویز کیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کا یہ نام فی الواقع بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب کی کتابت و طباعت خاص اہتمام سے ہوئی ہے۔ جلی قلم سے ہر سطر میں ایک ایک مصرع لکھوایا گیا ہے۔ کاغذ بھی نہایت اچھا اور دبیز لگایا گیا ہے۔ حسنِ ظاہری میں یہ کتاب "بانگِ درا" سے پوری مشابہت رکھتی ہے۔ اور ۵۴۷ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ سرورق میں نہایت سادگی سے کام لیا گیا ہے، اور اس کا دامن ہر قسم کی مصنوعی زیب و زینت سے خالی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جس طرح حضرتِ محروم کا کلام تصنع اور آورد سے پاک ہے، اسی طرح سرورق میں بھی تکلفات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ دو باتوں کی کمی خاص طور سے محسوس ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ کتاب مجلّد نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ اتنا زرِ کثیر صرف کرنے پر اسے مجلّد کرنے کا خرچ بھی برداشت کیا جاتا، دوسری کمی یہ ہے کہ اس میں مصنّف کی تصویر شامل نہیں کی گئی ہے۔[۱]

محروم صاحب دنیائے شعر و سخن میں کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کا کلام ملک کے چیدہ و برگزیدہ جریدوں اور مجلّوں نیز اخباروں کے خاص نمبروں میں عزت و احترام سے شائع کیا جاتا ہے۔ صوبہ ہٰذا کے درسی کتب میں بھی اُن کا کلام داخل کیا گیا ہے، اور سابقہ مجموعے کی اشاعت پر انھیں سرکارِ عالیہ کی

۱؎ حضرت جوش ملسیانی نے جن کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی ہے "گنجِ معانی" کے نئے ایڈیشن ([illegible]) میں رفع کر دی گئی ہیں۔

طرف سے انعام بھی مل چکا ہے۔ اس تمام عزت و افتخار پر اضافہ اس جدید مجموعۂ کلام کی اشاعت پر ہم فاضل مصنف کو مبارکباد کہتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ مصنف جن کا کلام اُن کی زندگی ہی میں شائع ہو کر مقبولِ خلق ہو جائے۔

بعض شعراء ایسے بھی ہیں، جن میں سے کسی نے تو مذہبی اور جماعتی خدمات کی بنا پر شہرت حاصل کی ہے۔ کسی نے اپنی خوش گلوئی سے نوجوانوں اور امیروں کا کھلونا بن کر ناموری بھی حاصل کی ہے، اور مذہبی تقدیس کی آڑ میں دولت بھی کمائی ہے۔ کسی نے اپنی کامیاب اور مسلّمہ زمانہ سازی سے یہ دونوں چیزیں حاصل کر لی ہیں۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ محروم صاحب اس قسم کی تمام کوششوں سے بالاتر ہیں۔ ان کی شہرت جو کچھ بھی ہے وہ بالکل حقیقی اور محض خدا کی دین ہے۔

محروم صاحب اس عزت و شہرت کے ہر طرح مستحق ہیں جو انھیں اس وقت دنیائے ادب میں حاصل ہے، اور خدا کرے کہ وہ اس سے بھی زیادہ ناموری و امتیاز حاصل کریں، ایک شیوہ بیان اور شیریں رقم شاعر کی ہستی تمام دنیائے ادب کے لیے باعثِ فخر و مباہات ہونی چاہیئے۔ خاص کر اس حالت میں جب کہ اس کا کلام ادب و اخلاق کا مرقّع اور نہایت پاکیزہ خیالات و جذبات کا آئینہ ہو، "گنجِ معانی" میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو کسی خاص گروہ یا کسی خاص شخص کے لیے باعثِ دل آزاری ہو۔ انتہا یہ ہے کہ عورتیں اور لڑکیاں بھی بشرطیکہ وہ اردو نظم

کا ذوق رکھتی ہوں۔ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھ کر مستفید ہو سکتی ہیں۔

اس مجموعے میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کے عنوان بالکل نئے ہیں مثلاً آندھی، سندھ کو پیغام، عالم آب، بچّے کی مسکراہٹ، مارِ آستیں، ویران گڑیا، پنجاب کے میدان، خدا کی امانت، جگنانے کی گھڑی، ان کے علاوہ قطعات، رباعیات، غیر زبانوں کے منظوم ترجمے، نوحے وغیرہ بھی ہیں۔ چند صفحات 'گلستاں' کے منظوم ترجمے کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا بالخصوص اسی بحر میں صنعت سے خالی نہیں۔ مثلاً ؎

کیا نامدار زیرِ زمیں دفن ہو چکے — ہستی کا جن کی روئے زمیں پر نشاں نہیں
اس پیر لاشہ کو جو کیا دفن خاک میں — یوں خاک کھا گئی کہ کوئی استخواں نہیں
زندہ ابھی ہے عدل سے نوشیرواں کا نام — مدّت ہوئی اگرچہ کہ نوشیرواں نہیں

یہ ترجمہ اصلی بحر اور وزن کو برقرار رکھ کر کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سے بہتر اور ہموار ترجمہ نظم میں اور نہیں ہو سکتا۔ 'شمعِ سحر' کے عنوان سے ایک مسدّس لکھا ہے۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

اے شمع تیری رونقِ بازار کیا ہوئی — گرمیِ ذوق و شوقِ خریدار کیا ہوئی
وہ آب و تابِ جلوۂ رخسار کیا ہوئی — وہ شب کدھر وہ بزمِ پُر انوار کیا ہوئی
کیا ہو گئے وہ ناز وہ انداز کیا ہوئے
وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے

شب بھر غریب تختۂ مشقِ ستم رہے | لیکن اُمیدوارِ نگاہِ کرم رہے
مر کر بھی راہِ عشق میں ثابت قدم رہے | جل کر گرے تو یار کے قدموں پہ ضم رہے

ہیں مہربانیاں فلکِ دُوں نواز کی
یوں منتشر ہے خاک شہیدانِ ناز کی

دونوں بند نہایت شاندار کہے ہیں۔ ہر ایک مصرعہ پختہ کلامی اور مشقِ سخن کا ثبوت ہے۔ کوئی لفظ بیکار نہیں، کوئی لفظ زائد نہیں۔ ہر ایک بند میں چاروں مصرعے برابر برابر قوت کے ہیں۔ ٹیپ کے شعر دونوں بندوں میں اپنے متعلقہ اشعار سے اس قدر مربوط ہیں کہ بالکل دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ یہی دو چیزیں مسدس میں خوبی اور حُسن پیدا کرنے والی ہوا کرتی ہیں۔ "وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے" اس مصرعے کی داد بیان کی طاقت سے باہر ہے۔

بہت سی تلاش کے بعد جب رام سیتا کو نہیں پاتے تو یوں گویا ہوتے ہیں؀

کہسار میں وہ آئینہ سیما نہیں ملتا | صحرا میں کہیں نقشِ کفِ پا نہیں ملتا
گلزار میں اپنا گُلِ رعنا نہیں ملتا | دریا میں بھی وہ گوہرِ یکتا نہیں ملتا

پہلے ہی تھا ویرانے میں کاشانہ ہمارا
اب اور بھی ویراں ہوا ویرانہ ہمارا

اشجار مجھے اُس کا پتا کیوں نہیں دیتے | پتوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے

مُرغانِ ہوا تم ہی بتا کیوں نہیں دیتے　　　سینا پہ جو گزری ہے کہ سنا کیوں نہیں دیتے

بھرتا نہیں دم کوئی بھی فریاد رسی کا

سچ ہے کہ نہیں کوئی مصیبت میں کسی کا

یہ کہنا کہ ان دونوں بندوں میں حضرت انیسؔ کی رُوح بول رہی ہے، ذرا بھی مبالغہ نہیں، کہسار کے لیے آئینہ سیما، صحرا کے لیے نقشِ کفِ پا، گلزار کے لیے گُلِ رعنا، دریا کے لیے گوہر یکتا، کیسے روشن مناسبات ہیں۔ گلِ رعنا اور اپنا گُلِ رعنا، اس اندازِ بیان کو کیا کہیے۔ پتّوں کو زبان سے نسبت مصنوعی نہیں بلکہ یہ مسلّمہ تشبیہ ہے۔ ایک ایک مصرع حسنِ بیان کی تصویر ہے، اور اس میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ بالکل بے ساختہ ہے۔ بند کا شعر کس قدر حسبِ حال لکھا ہے۔ دوسرے بند میں بھی چاروں قافیے نہایت چُست ہیں اور باوجود اس خوبی کے وہ بے تکلّفانہ نثر ہیں۔ یہ خوبی پیدا کرنی آسان نہیں۔ اس محل پر مُرغانِ ہَوا کو مخاطب کرنے کا خیال نہایت قابلِ داد ہے، کیونکہ اوجِ پرواز کی وجہ سے وہ دُور دُور تک نظر اُڑا سکتے ہیں۔ اس قسم کی تمنّاؤں کے بعد آدمی اکثر مایوس ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ بند کا شعر اسی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ دونوں بند پڑھ کر تمام اہلِ ذوق خوش گفتی و درسفتی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دریا کی طغیانی پر عالمِ آب کے عنوان سے ایک ترجیع بند لکھا ہے،

اس کے یہ دو حصے قابلِ غور ہیں :-

قریہ قریہ میں دکھاتا ہے روانی پانی | گلی کوچوں میں خرابی کا ہے بانی پانی
گاؤں والوں کا ہوا دشمنِ جانی پانی | غرض آبادی و ویرانہ ہے پانی پانی

ہر کجا می نگرم عالمِ آب است اینجا

پانی رُک رُک کے ہوا جاتا ہے بیتاب کہیں | موجیں اُٹھتی ہیں کہیں اور ہے گرداب کہیں
کہیں اک زور کا ریلا ہے تو سیلاب کہیں | تا بگردن ہے کہیں اور ہے پایاب کہیں

ہر کجا می نگرم عالمِ آب است اینجا

پہلے بند میں قافیوں کا حسن کس قدر دیدہ زیب ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ "خرابی" بہت بلیغ واقع ہوا ہے۔ چاروں مصرعے بہت صاف اور ہموار لکھے گئے ہیں، اور ان میں جو باہمی ربط ہے، وہ پانچویں مصرعے کی شان کو دوبالا کر رہا ہے۔ ان ظاہری باتوں کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ قابلِ داد ہے، وہ ان مناظر کی تفصیل ہے جس میں واقعات اور مشاہدے کے نتائج کی تطبیق پورے طور سے نظر آتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ یہاں قوّتِ بیانیہ کا اظہار کرنے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔

"گنگا" پر ایک نظم لکھی ہے۔ اس کا یہ بند ملاحظہ ہو :-

نورِ سیال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تُو | حیرت افروزِ دل و دیدۂ حیراں ہے تُو
کس دل آویزی و تیزی سے خراماں ہے تُو | مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہو کہ پنہاں ہے تُو

حُسنِ بے تاب نمائش سے پشیماں کیوں ہے
پردۂ رُخ ترا جلوہ سے گریزاں کیوں ہے

محروم صاحب کے کلام میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ ہر ایک مضمون پر شاعرانہ نکتہ نگاہ سے اظہارِ خیالات کرتے ہیں اور سخن گسترانہ انداز کو کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تمام نظم کہنے والے شعرا میں یہ وصف ہونا چاہیئے، کیونکہ اگر اندازِ بیان شاعرانہ نہ ہو تو اس نظم سے نثر بدرجہا بہتر ہے۔ اس بند میں جو اندازِ تغزل پیدا کیا گیا ہے، وہ نہ صرف قابلِ ستائش ہے، بلکہ ہر ایک نظم گو کے لئے قابلِ تقلید بھی ہے۔ مصرعۂ اوّل میں دونوں تشبیہیں بہت نادر اور نہایت خوبصورت ہیں۔ ان کی لطافت اور جدّت مصنّف کے لئے ہر لحاظ سے مایۂ صد افتخار ہے، دوسرے مصرعے میں حیرت افروز کی ترکیب بجائے خود گنجِ معانی ہے "مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو" اس مصرعے کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ یہ خیال آرائی کا نگارخانہ ہے۔ اتنی مفہوم آفرینی اور اس قدر جدّتِ خیال کے باوجود مصرع اس قدر ہموار اور بے ساختہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے، اور پھر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ غرض کس کس چیز کی داد دی جائے۔ ان دلکش مصرعوں کے بعد بند کا جو شعر کہا گیا ہے وہ سراپا تغزل ہے۔ مثنویِ سحر کی تعریف میں ایک تقریظ منظوم بھی ہے۔ اس کے یہ شعر کس قدر پختہ اور ٹھوس ہیں ؎

جاں بخش بھی دل گداز بھی ہے
ہے سوز بھی اس میں ساز بھی ہے

نغمے ہیں سرور پاش اس میں | نالے ہیں جگر خراش اس میں
جلوے کہیں اس میں بزم کے ہیں | نقشے کہیں اس میں رزم کے ہیں
امکاں کا ہے گو ظہور اس میں | عرفاں کا بھی ہے سرور اس میں

جاں بخش اور دل گداز یہ دونوں متضاد اوصاف ثابت کرنے کے لئے جو مصرع لگایا گیا ہے، اس سے بہتر کوئی اور صورت خیال میں نہیں آسکتی۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں ترصیعِ کامل کا پورا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ چاروں شعر مصنف کی مشقِ سخن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

جگرؔ بریلوی کی ایک غزل پر تضمین کی گئی ہے۔ اس کا ایک بند یہ ہے ؎

دامنِ زیست چاک ہونے دے | قصّہ ہوتا ہے پاک ہونے دے
خاک کو تابناک ہونے دے | راہ میں اپنی خاک ہونے دے

اور کچھ میری التماس نہیں

اس بند میں زبان کی صفائی، مصرعوں کی ہم آہنگی اور تضمین کی خوبی غرض ہر چیز لاثانی ہے۔ تینوں مصرعوں سے اصل شعر کے مضمون میں جو زور پیدا ہو گیا ہے وہ خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ رباعیات جتنی لکھی گئی ہیں اُن میں حسنِ بیان اور خوش کلامی کا رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جو کچھ لکھا ہے ایک رنگ میں لکھا ہے، اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں کوئی نکتہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ مثلاً ؎

دُنیا میں برائے مردم کم مقدار | اہلِ شوکت ہیں باعثِ صد آزار
راہوں میں رہروانِ منزل کے لیے | اُڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار

مغرورِ اہلِ زر بیچارے غریبوں سے جو سلوک روا رکھتے ہیں اُسے ہر شخص جانتا اور ہر روز مشاہدہ کرتا ہے۔ اس موضوع پر ایک دو رباعیات نہیں بلکہ صدہا دردناک نظمیں لکھنے کی ضرورت ہے۔ محروم صاحب نے کس قدر حق گوئی سے کام لیا ہے، اور اس کے لیے جو مثال تلاش کی ہے، وہ حسنِ تلاش کا بہترین ثبوت ہے، شاعرانہ حسنِ بیان کا نہایت وقیع پہلو یہ ہے کہ پیش پا افتادہ واقعات کے دُور دُور کے نکات پیدا کر لیے ہیں۔

ہمارے خیال میں اس تصنیفِ لطیف کا معرکۃ الآرا حصہ وہ ہے جس میں حضرت محرومؔ کی وہ ماتمی نظمیں شامل ہیں جو اُنھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وفات الم آیات پر لکھی ہیں۔ ان نظموں میں واقعہ نگاری کا وہ کمال دکھایا ہے کہ باید شاید۔ سبحان اللہ کتنے دردناک اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے مضامین نکالے ہیں، کسی خاص سلسلے کا خیال چھوڑ کر متفرق مقامات سے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ پہلی نظم کو یوں شروع کیا گیا ہے ؎

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری | ہے سب طرح سے مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمھاری وہ طرزِ غمخواری | کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

یہ بند کتنا رقت آمیز ہے۔ مرثیت کی کون سی بات ہے جو اس میں نہیں پائی جاتی۔ ہندو عورتوں کا کیرکٹر کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ "یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی"۔ یہ مصرع کس بلا کا ہے، کلیجہ تھام کر بھی پڑھا نہیں جا سکتا ہے

کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے
ابھی سے ہو گئے تیار کیوں سفر کے لئے

اس شعر میں وہ عہدِ وفا بیان کیا گیا ہے جو ہندوؤں کے ہاں شادی کی تقریب کا نہایت ضروری حصہ ہے

گزرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی
شباب پر ہے تمھارا تو بال بال ابھی
ہے یاد مجھ کو وہ برسوں کی زیرِ لب فریاد
تمھاری آہ جگر سوز پر تعب فریاد
دل و جگر پہ مرے ڈھا گئی غضب فریاد
کہ کرنے والے نہ تھے تم تو بے سبب فریاد
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشم نم کی طرف
بڑھاؤ ہاتھ نہ لے جاں مرے قدم کی طرف
خیال میرے دلِ دردمند کا کرتے
شریکِ شادی و غم تھے تو پھر وفا کرتے
جو چھت سے بچۂ کنجشک کوئی آن گرا
اٹھا اٹھا کے اسے تم نے آشیاں میں رکھا

•

کسی سے کرتے نہیں کوئی بات واأسفا
نہ تھے تم ایسے تغافل صفات واأسفا
دھرے ہی رہ گئے نسخوں پہ ہات واأسفا
کٹے گی کس سے یہ ماتم کی رات واأسفا

سال بھر کی شیر خوار بچی کے متعلق اسی سلسلے میں مفصلۂ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں ۔

لو اُٹھ کے بیٹھو کہ ودّیا سرہانے آئی ہے
تمہارے منہ سے وہ دامن اُٹھانے آئی ہے

وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہوگی
تمہارے پیار سے پھر اس کو تازگی ہوگی

اُٹھا بھی لو کہ بہت بیقرار ہے ودّیا
نہ چھوڑ جاؤ اسے شیر خوار ہے ودّیا

پکارتی ہے تمہیں آج کس قرینے سے
اُبل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے

***

گھٹنوں پہ چل کے نکلی بستر کے پاس پہنچی
ننھے سے دل میں اپنے کچھ سوچ کے آن پہنچی

کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اٹھا کر
منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچے وہ لدلدا کر

***

ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہو
پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے

***

مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے
مجھ سخت جاں پہ یا رب یہ کیا گزر رہی ہے

***

اس مقام پر پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے۔ کہاں تک لکھیں، دل بھر آتا ہے، قلم بھی اشکبار ہوا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ اشعار کس دل سے نکلے ہیں، اور اس مصیبت میں یہ لاجواب نظم کیوں کر کہی گئی ہے۔

آخیر میں ہم جناب محروم کو "گنج معانی" کی ترتیب و اشاعت پر دوبارہ مبارک باد کہہ کر اس تنقید کو ختم کرتے ہیں، اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ طوالت کے خیال سے اُنھیں وہ داد نہیں دے سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ تمام اہلِ ذوق کو اس پاکیزہ کلام کی قدر کرنی چاہیئے۔

"رہنمائے تعلیم" لاہور
اپریل ۱۹۳۳ء

"گنجِ معانی" پر ایک نظر

عدم

ہرچند حضرتِ محرومؔ ایک غم نگار شاعر ہیں، اور "گنجِ معانی" کے دیباچے میں شیخ سر عبدالقادر نے بھی یہی لکھا ہے کہ وہ خصوصیت جو ان کے ہاں "مقامی رنگ" سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ جذباتِ حزنیہ کی مصوّری ہے۔ لیکن مجھ سا "خرابِ رنگ و بو" انسان اپنے مذاق ہی کی کوئی چیز اُن کے کلام میں تلاش کرے گا۔ مجھے یقیناً یہ معلوم کر کے دلی مسرّت ہوئی کہ کافی حصّہ اُن کے کلام کا "بہار اور شباب" کی وجدانی کیفیتوں کے نقوش کا حامل ہے۔ غم کیا ہے؟ بیتے ہوئے رنگین دنوں کی یاد! ایک پُر جنون اور ولولہ انگیز آغاز کا سرد اور جمود آور انجام۔ مجھے انجام سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں استمرار اور ناتمامی کا جویا ہوں۔ کیونکہ زندگانی نام ہے ایک مسلسل

التہاب، ایک غیر مختتم جدّ و جہد اور ایک دائمی بیقراری کا۔ موت میرے نزدیک ایک اتفاق ہے۔ جس کے علی الرغم زندگی کی ہائے و ہو جاری ہے ؎

اجل تو اک اتفاق ہے، اتفاق کا کچھ گلا نہیں ہے
وگرنہ جو ذی حیات ہیں اُن کی جستجو کو فنا نہیں ہے (عدمؔ)

مجھے یقین ہے کہ اگر زمانہ حضرتِ محرومؔ کے دورِ مسرت کو محدود نہ کر دیتا، ان کی خوشی، زندہ دلی اور شگفتگی برقرار رہتی تو اُن کے کلام میں ہمیں حسن اور جوانی کی رنگ رلیوں کے دلفریب مناظر ہی فراوانی سے نظر آتے۔ کیونکہ قدرت سے وہ نہایت ہی لطیف ذوقِ نظر لے کے آئے تھے جو حُسن کی طلسماتی کیفیتوں میں غرق ہو کر رہ جاتا تو بہتر تھا، کیونکہ انجام آشنا ہو کر اُن کے ذوقِ نظر نے اُن کی شاعری کو المیہ بنا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر و بیشتر مقامات اُن کی المیہ شاعری کے نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت گراں پایہ ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے غمگین دل کی دھڑکن نے شعروں کا روپ بھر لیا ہے۔ لیکن کون ہے جو دیر تک ٹھنڈی سانسوں اور گرم اشکوں کے ماحول میں رہنے کی تاب لا سکے۔ اثر صہبائی کا ایک شعر ہے ؎

جب یہ خزاں بھی ایک فریبِ نگاہ ہے
بہتر ہے مبتلا ہوں فریبِ بہار میں

دنیائے فانی کی ہر چیز ایک دھوکا ہے۔ جب دھوکوں ہی سے سابقہ ہے

توکم از کم انسان ایسے فریب میں تو مبتلا ہو جو رنگین و دل آویز ہو۔ میری آرزو ہے کہ کاش وہ طلسمِ آب و رنگ جس سے متاثر ہو کر جنابِ محروم نے مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں ہمیشہ ان کی نگاہوں میں قائم رہتا۔ دیکھیے بہار کی کیا زندہ تصویر کھینچی ہے، نظم پڑھ کر دل میں اُمنگیں مچلنے لگتی ہیں۔

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی
عطر اُڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

●

سبزہ و گلزار کو کرتی ہوئی شادکام
بھرتی مسرّت کے جام
دہر کو دیتی ہوئی دورِ طرب کا پیام
ہنستی ہنساتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

●

دورِ زمستاں میں تھے دل لوئے جن کے خموش

اب ہیں وہ محوِ خروش

زمزمہ پیرائی کا بھرتی ہوئی ان میں جوش

وجد میں لاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی

•

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی

صبر اُڑاتی ہوئی

پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی

درد اُٹھاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی

بسنت کے کیف آور اور بہار آفریں موسم سے متاثر ہو کر شاعر کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کا رنگ ذرا ملاحظہ کیجیے۔

رخصت ہوئی دُنیا سے

افسردگی سرما

پھر تازگی و تیزی سُورج کی چمک میں ہے

اک شانِ دلآویزی شبنم کی دمک میں ہے

پھر ولولہ انگیزی پھولوں کی مہک میں ہے

انداز جنوں خیزی بلبل کی چہک میں ہے
پھر گلشنِ عالم میں
ہنگامہ ہوا برپا

ایک نظم میں محروم صاحب نے ابر بہار سے خطاب کیا ہے۔ اس سے کچھ شعر ذیل میں ماخوذ ہیں، ملاحظہ فرمایئے، کتنے روشن حقائق پیش کئے گئے ہیں۔

ابرِ نیساں ہے سحابِ فیض کہلاتا ہے تُو
مستِ صہبائے کرم ہے جھومتا آتا ہے تُو

خوشنما دوشِ ہوا پر ہے ترا تختِ رواں
اس کی کیا توصیف ہو جس شان سے آتا ہے تُو

جب زمینِ خشک پھیلاتی ہے دامانِ سوال
رحمت باری کے موتی اُس پہ برساتا ہے تُو

تازگی پاتے ہیں تیرے نام سے اہلِ زمیں
آسمانوں سے پیامِ زندگی لاتا ہے تُو

تیسرے شعر میں پیرایۂ بیان کس قدر بلیغ معنی خیز اور حسن آفریں ہے۔ چوتھا شعر ایک بلند پاکیزہ اور وجد انگیز تخیل کا ایک قابلِ رشک اور بہترین نمونہ ہے، زندگی کی "نورانیت" کو شاعر نے نہایت دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ زندگی کا سرچشمہ آسمانوں میں ہے۔ یہ نظریہ شعریت کی جان ہے۔

"فصلِ بہار" سے تین شعر پیش کرتا ہوں۔ آپ خود حکم لگا دیجئے کہ ان "کافر" شعروں کو کس شے" سے تعبیر کیا جائے؟

حُسن اسی فصل میں نکھرتا ہے
عشق اسی دَور میں اُبھرتا ہے

صورتِ گُل کوئی سنورتا ہے
پیرہن کوئی چاک کرتا ہے

آرزوہائے خفتہ کو بیدار کر ہی دیتی ہے آہ! بوئے بہار

منظر نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو فضا شاعر اپنے اشعار میں پیش کرے وہ پڑھنے والے کے ذہن پر ہی نہ چھا جائے، بلکہ اُسی فضا کے تاثرات اس کے محسوسات پر محیط ہو جائیں۔ اس اعتبار سے حضرتِ محروم کے مندرجہ ذیل شعر کو اگر لاجواب نہ کہا جائے تو انصاف کا خون کرنا ہے۔ مجھے تو یہ شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاروں بھری رات میں کسی جوئبار کے کنارے آ بیٹھا ہوں۔

تاروں کی چھاؤں میں جو تو آتی ہے باغ میں
ٹھنڈک سی ڈال دیتی ہے لالے کے داغ میں

(نسیم بہار)

بندرابن کی ایک صبح کا نقشہ کھینچتے ہوئے جنابِ محروم لکھتے ہیں ؎

مشرق میں ہے نور ہلکا ہلکا
طلعت کا ظہور ہلکا ہلکا

ایک ہی شعر میں صبح کے طراوت بخش اور روح پرور موسم کی تصویر کھینچ دینا اور وہ بھی اس جامعیت کے ساتھ ایک قادر الکلام شاعر ہی کے بس کی بات ہے۔
"گنگا" سے جو روایاتِ پاکیزگی و تقدس وابستہ ہیں اُن کو محروم صاحب نے اپنے ذہنِ خلّاق کے اعجاز سے خوب نباہا ہے۔ گنگا سے خطاب کرتے ہیں ؎

جوش زن رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر | بہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر
آئی ہے راہروِ عالمِ بالا ہو کر | رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریا ہو کر

•

نورِ سیّال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو
حیرت افروزِ دل و دیدۂ حیراں ہے تو

نفسیات کا ایک طے شدہ مسئلہ ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں میں جو حسن ہمیں نظر آتا ہے وہ ہماری اپنی نظروں کا حُسن ہے۔ دو انسان بیک وقت آسمان کی جانب دیکھتے ہیں، لیکن ایک کو ستاروں کا حسن مجنون کر دیتا ہے۔ دوسرا صرف ایک سرسری نگاہ ڈال کر بغیر کوئی روحانی کیفیت اخذ کئے دوسری طرف متوجّہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ تلخ مشاہدہ بھی ایک دل گداز حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ ہمیشہ حُسن بین نگاہیں ہی انجام کارغم سے آشنا ہوتی ہیں، وہ آنکھیں جن میں حُسن بینی کی اہلیت موجود نہیں لذتِ گریہ سے بھی ہمیشہ محروم رہتی ہیں۔ جنابِ مخدوم کی ایک نظم وہ ہے جس کا نام انھوں نے "محبّت کے کرشمے" رکھا ہے۔ اس کے تین جزو پیش کرتا ہوں۔

جانبِ مشرق گئی جب سحدم نغائی نظر | واژگوں اک کاسۂ حسرت فزا تھا آفتاب
دفعتہً مستانہ بین نے اس پہ اک ڈالی نظر | جامِ زرّیں میں چھلکتی تھی محبّت کی شراب

•

ہو گیا خورشید اچھل آنکھ سے اوپر سبر گرد سی اُڑتی نظر آئی سوادِ شام میں
ہو گیا محروم لیکن چشمِ الفت کھول کر زُلفِ جاناں کا تماشائی سوادِ شام میں

•

محفل آرائے شبستانِ فلک غائب رہا گرچہ شمعوں کی طرح روشن ستارے ہو گئے
لیکن انجم سے لڑیں جب یار کی آنکھیں ذرا انکشافِ راز کو کیا کیا اشارے ہو گئے

جو شخص ذوقِ نظر کی ان کیفیتوں سے گزر چکا ہو اس کا غم آشنا ہونا کتنا ناگزیر ہے، اور اگر محروم صاحب کا ذوقِ شعر ہی غم کی طرف مائل ہو گیا ہے تو وہ ایک قدرتی بات ہے۔

محروم صاحب کے کلام میں سے تقریباً دو تہائی حصّہ بیانیہ نظموں کا ہے، بیانیہ نظموں میں محروم کے زورِ بیان کا جو عالم ہے وہ مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ نظر آ سکتا ہے۔ ایک چیز جو خصوصیت سے اُن کی بیانیہ نظموں میں نظر آتی ہے "صنعتِ آہنگ" ہے ——— ایسے الفاظ منتخب کرنا جن کا صوتی تلازم ہی نظم کے موضوع پر حاوی ہو صنعتِ آہنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ نظموں کے مختلف اجزا کا باہمی تطابق، آغاز و انجام کی دلچسپی، برمحل گریز، تمثیلات کا تنوع، تخیل کی پختگی، اور ایجاز و اختصار کا صحیح استعمال ان نظموں کی روحِ رواں معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ایک دو نظموں کا کچھ اقتباس درج کرتا ہوں۔

پھولا ہوا ہے کس لئے! کیا بلبلے میں ہے
اللہ! کونسی یہ ہوا بلبلے میں ہے
اُف کس قدر غرور بھرا بلبلے میں ہے
فرعون کوئی آکے چھپا بلبلے میں ہے
کتنا اُبھار، کتنی اکڑ، کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

(بلبلہ)

توصیف لب پہ لالہ و گل کی سدا رہی
پیشِ نظر خرامشِ بادِ صبا رہی
محروم دلفریب یہ طرز ادا رہی
اک ڈھنگ پر مگر تری طبع رسا رہی
اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح
آندھی کلور کوٹ کی چلتی ہے کس طرح

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھنکارتی
للکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی
ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم ابھارتی
اُڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اُتارتی
یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی
ہلچل زمین زماں میں مچاتی ہوئی چلی

(آندھی)

محروم کا مجموعۂ کلام مختلف حصّوں پر منقسم ہے، اور ان میں سے ہر ایک حصّہ مختلف موضوعات کے لئے وقف ہے۔ رباعیاں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ لیکن غم و اندوہ کے عمیق اور جاں گداز جذبات میں ڈوبی ہوئی۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے حضرت محروم کی "دردنگاری" کا رنگ بخوبی

واضح ہو جاتا ہے ؎

دل خوں ہے وہ انقلاب دیکھے میں نے
دنیا میں بہت عذاب دیکھے ہیں نے

تسکین دیتا ہوں دل کو اب یہ کہہ کر
وحشت انگیز خواب دیکھے ہیں نے

٭

آہیں وہی اور اشکباری ہے وہی
ابر آلام دل پہ طاری ہے وہی

مردہ ہوں کہ لطفِ زیست سے ہوں محروم
زندہ ہوں کہ دل کی بےقراری ہے وہی

(رباعیات)

ایک رباعی میں حضرت محروم نے خدا کے وجود کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ لیکن نہایت بلیغ استدلال سے ؎

معدوم اُسے نہ جان جو ہے مستور
ظلمت کے مقابلے میں موجود ہے نُور

اے منکرِ ذاتِ حق ذرا کھول آنکھیں
فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور

میں نے جو کچھ محروم صاحب کے کلام کے متعلق لکھا ہے وہ میری ایک سرسری نظر کے تاثرات کا مجموعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ محروم جیسے شاعر کے کلام پر ایک مبسوط اور عمیق تبصرہ کافی فرصت اور محنت و کاوش کا مقتضی ہے، اور مجھ جیسے کم فرصت اور مشغول انسان سے یہ مہم سر نہیں ہو سکتی۔

"شاہکار" لاہور

جنوری ۱۹۴۰ء

محروم کی شاعری

عطاء اللہ کلیم

اُردو شاعری کا دورِ انقلاب تاریخِ ادب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اس مختصر دور میں جو بیسویں صدی کے زمانۂ قبل از جنگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، تقلید اور اجتہاد کی قوتیں اردو شاعری کی قسمت کا فیصلہ کر رہی تھیں۔ قیودِ زبان اور آزادئ خیال، صداقتِ احساس اور کمالِ فن، سادگی اور تکلف میں جنگ ہو رہی تھی۔ قدیم شاعری کے پرستار جن کی دُنیا میں قصیدہ اور غزل کے سوا کچھ نہ تھا، اور جن کے مذہب میں ممدوح اور معشوق کے نام کے سوا کسی اور کا نام لینا گناہ تھا۔ "چشم بند و لب بہ بند و گوش بند" پر عمل کئے زمانے کی صدا سے بے خبر اور دنیائے عمل سے بے نیاز ہو کر بیٹھے تھے۔ جس طرح ایک شرابی

کسی خستہ مکان میں بیٹھا ہوا زلزلے کی تباہ کاریوں کو خاطر میں نہ لائے، اور جانِ عزیز انقلابِ دہر اور اپنی کاہلی کی نذر کر دے۔ اردو کے سامنے دو راہیں کھلی تھیں۔ متزلزل ویرانے میں قدیم روایات کے ڈھیر کے نیچے دب کر جان دینا یا اس برباد ویرانے کو چھوڑ کر کھلی دنیا میں کش مکشِ زندگی کو جاری رکھنا اور اور اگر ممکن ہو تو حادثے سے دور ایک نیا ایوان تعمیر کرنا۔

ایک حسین اور مانوس فضا میں ان محبوب چیزوں کو دیکھتے ہوئے، جن کو ایک شخص سرمایۂ زندگی سمجھتا ہو جان دینے میں ایک قسم کی دل کشی تو ضرور ہے، جس طرح مردہ شوہر کی لاش پر جل مرنے میں یا اپنے دیوان کو اپنی محبوبہ کے ساتھ دفن کرنے میں، لیکن یہ امر قانونِ فطرت کے خلاف ہے، اسی طرح قدیم شاعری کی شمعِ مردہ کے پروانے ایک ایسے حسین لیکن فضول مقصد کے لئے سرگرداں تھے، جسے کوئی صاحبِ عقل نظرِ استحسان سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ الفاظ کی شوکت پر فریفتہ تھے، زبان کی صفائی پہ لٹّو تھے، محاورہ اور روزمرہ کے شیدا تھے، اور تشبیہ و استعارہ پر مرتے تھے۔ لیکن حسنِ معنی سے بے پروا تھے، ان کی نظر سادگی پسند نہ تھی، ان کے دل سوزِ حقیقی سے نا آشنا تھے۔ وہ انہی پرانے مضامین کو چمکا کر پیش کرتے تھے، جن سے قدما کے دیوان بھرے پڑے تھے، جو قدما نے صدیوں پہلے کے فارسی شعرا سے مستعار لئے تھے۔ وہ الفاظ کی ساحری سے دلوں کو مسخر کرتے رہے، لیکن آخر ایک مردِ خدا کی دردناک آواز

نے اُن کا طلسم توڑ دیا۔

جدید اور قدیم شاعری کی کش مکش گویا دل اور زبان کا مقابلہ تھا جس میں دل کی جیت ہوئی۔ زبان اپنی دل کشی کے باوجود دل کے مقابلے میں ثانوی حیثیت قبول کرنے پر مجبور ہوئی اور اُردو نے حالی کے اس ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ؎

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں! | پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تُو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام | ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تُو
چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جا دلوں میں گھر | اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تُو

"سچ سے دلوں میں گھر کرنا" جدید شاعری کا طغرائے امتیاز یہی ہے، اور موجودہ دور میں اس امتیاز کا اہل جناب تلوک چند محروم سے زیادہ شاید ہی کوئی ہو جن کا کلام سراسر صداقتِ احساس پر مبنی ہے، یا بالفاظِ دیگر وہ ازراہِ تکلف شعر نہیں کہتے، بلکہ محرومیوں نے انھیں شاعر بنا دیا ہے۔

محروم نے اپنی جوان رفیقۂ حیات کی وفات پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ رقت اور درد انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اگرچہ اُنھوں نے "کمالِ شاعری" دکھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن پڑھنے والا ہر شعر پر دل تھام کر رہ جاتا ہے۔ "اشکِ حسرت" کے پہلے دو بند ہی لیجیے:۔

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری | ہے بے طرح متر شح نظر سے بیزاری

کہاں ہے آج تمہاری وہ طرزِ غمخواری　　　کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی

چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف　　　چلے ہو تاروں کی چھاؤں میں کیوں عدم کی طرف

نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف　　　بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف

مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے

رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

شوہر کے قدم کی طرف ہاتھ بڑھانا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے معافیاں مانگنا اور ایسی جزئیات جن سے ہندوستانی خاتون کے اخلاقی پہلو پر روشنی پڑتی ہے، نوحے کو بہت مؤثر بنا دیتی ہیں۔ واقعے کی الم انگیزی اس بات سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ محروم کی دودھ پیتی بچی اپنے معصومانہ انداز میں شفیق ماں کی محبت کو ڈھونڈھ رہی ہے، اور کوئی جواب نہ پا کر وہ بھی موت کی دلگداز حقیقت سے آشنا ہو جاتی ہے۔

اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے

خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے

یہ دل ہلا دینے والی حقیقت بھی شاعر کو دہریت کے آغوش میں نہیں دھکیلتی، وہ جی کڑا کر کے اپنی مصیبت کو برداشت کرتا ہے اور کہتا ہے "جو تجھے منظور ہو یا رب

مجھے منظور ہے" وہ نہ آسمان سے گلہ کرتا ہے نہ تقدیر کو کوستا ہے، اس کا فلسفۂ غم ایک زبردست اخلاقی پہلو لیے ہوئے ہے۔ جیسے ایک نظم "ناپائیدار رشتے" سے ظاہر ہوتا ہے۔

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے اُلفت و مہر و وفا کے ہیں
یہ مادر و پدر و زن و فرزند و اقربا — شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں
مل جل کے جائیں گے نہ بہم ہوکے آئے تھے — رشتے نہاں نظر سے حیات و فنا کے ہیں
چاہت کا وہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں — عمر دو روزہ پر اُنھیں دھوکے بقا کے ہیں

محروم کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اپنے غم کو تمام دنیا کا غم بنا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوسروں کے غم کو بھی اپنے غم کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ ان کے سینے میں ایک ہمدردِ مخلوقات دل ہے جس سے وہ نہ صرف نوعِ انساں کے مصائب کو محسوس کرتے ہیں بلکہ ہر ذی رُوح کی مصیبت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کی نظمیں "چڑیا کی زاری"، "بلبل کی فریاد"، "مچھلی کی بیتابی" اور "کولھو کا بیل" اس دعوے کی شاہد ہیں۔

غم ناک مناظر کے بیان کرنے میں محروم کو خاص قدرت حاصل ہے۔ اُن کی طبیعت کا رجحان اسی طرف ہے۔ ان کا دل سوزِ غم سے آشنا ہے۔ اس لئے وہ کامیابی سے اوروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ رامائن کے المیہ مناظر کا نقشہ جس خوبی سے انھوں نے کھینچا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ رام چندر جی اور مہارانی

سیتا کی درد بھری داستان سن کر کونسا دل ہے جو بھر نہ آئے۔ لیکن محروم نے راون کی موت کا منظر بھی اس دلگداز پیرائے میں بیان کیا ہے جس کی ایک کامیاب مصور سے توقع ہو سکتی ہے۔ راون کی رانیاں اس کی لاش کو دیکھ کر سر پر خاک ڈالتی ہیں اور اس طرح نوحہ کرتی ہیں۔

کہتی تھی بازوؤں کو کوئی تھام تھام کے
ہم بے کسوں کا آہ سہارا یہی تو تھے
ان بازوؤں کی آہ! وہ قوت کدھر گئی
جن سے اُٹھے پہاڑ وہ طاقت کدھر گئی
کیوں گردنِ اجل میں حمائل ہوئے یہ ہاتھ
ہم سے نہ ذوقِ وصل کے سائل ہوئے یہ ہاتھ
کہتی کوئی یہ شعبدے بھاتے نہیں ہمیں
لو اٹھ کے بیٹھو موت کا آیا یقیں ہمیں

طاقت سے اپنی زیر جو اِندر کو کر چکا!
وہ فانیوں کے تیرِ ہوائی سے مر چکا!

شاعر نے سرکش دشمن کی عظمت کا نقشہ کن مؤثر الفاظ میں کھینچا ہے، اور وفادار رانیوں کے جذباتِ محبت کی ترجمانی کس خوبی سے کی ہے۔ اللہ! اللہ! گناہ کے سائے میں بھی نیکی کے کیسے مظاہر ہوتے ہیں! راون کی خاص رانی مندودری کی زبان سے یہ عبرت ناک داستان سنیئے۔

کہتی تھی پرانناتھ نہ کہتی تھی آپ سے
پاپی کی موت پاپ ہی، باز آؤ پاپ سے
تقدیر تھی جو دشمنِ جانی ہزار حیف
میری نہ ایک آپ نے مانی ہزار حیف
وہ دن بھی تھے کہ آپ سے ڈرتے تھے دیوتا
دم آپ کے جلال کا بھرتے تھے دیوتا

لرزتے ہیں جس کے دم سے تھے افلاک وا دریغ   بے حس پڑا ہے اب وہ سرِ خاک وا دریغ

•

ہوتا ہے یوں ظہور خدا کے عتاب کا   چرچا رہے گا دہر میں اس انقلاب کا

تا روزِ حشر باعثِ عبرت رہیں گے ہم   آماجگاہ تیرِ ملامت رہیں گے ہم

محروم کی شاعری کا بیشتر حصہ درسِ عبرت کے لئے وقف ہے۔ عظمت و شوکت کو خاک میں ملتے دیکھتا ہے، اور آہِ سرد بھرتا ہے۔ خود روتا ہے اور اوروں کو رُلاتا ہے۔ کبھی وہ جہانگیر کے مقبرے کو حسرت کی نظروں سے دیکھتا ہے، کبھی نورجہاں کی شکستہ قبر پر نوحہ خوانی کرتا ہے۔

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے   کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورجہاں ہے

مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے   اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلوؤں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم

تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم   (نورجہاں کا مزار)

اسی نظم کا ایک بند حقیقت نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ شاعر ایک باکمال مصور کی طرح جزئیات اور تفاصیل کو کام میں لاتا ہے۔

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر   آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر

اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر   اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

اللہ اللہ! کیا بھیانک منظر ہے! کون دل ہے جو اسے دیکھ کر پگھل نہ جائے گا۔ کون ذی فہم ہے جو اسے دیکھ کر انسان کی بے بسی کا اعتراف نہیں کرے گا۔

مخدوم کی دنیا میں انسان ایک بے بس مخلوق ہے اس کے مقابل فطرت ایک پُرجلال اور باعظمت شخصیت ہے۔ شاعر کا تمام زورِ بیان قدرت کے جلالی مظاہر کی تشکیل میں بروئے کار آتا ہے۔ "آندھی" اور "عالم آب" میں مخدوم کا کلام جوانی پر ہے، اور ایسی نظموں پر اُردو ادب ناز کر سکتا ہے۔ دیکھیے "آندھی" اس طرح چلتی ہے۔

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے ۔۔۔ بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے ۔۔۔ آتی ہے فوج دیو نظر چال ڈھال سے

روپوش اس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخ آسماں ہوا

مشہور ہے کہ تباہ کاری کے مناظر میں انگریزی شاعر بائرن کو خاص ملکہ حاصل ہے، لیکن یہ نظم پڑھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مخدوم انگریزی شاعر سے پیچھے ہے۔ اسی طرح "عالم آب" بائرن کی نظم "سمندر" کا مقابلہ کرتی ہے،

سمندر کا جلال دیکھ کر جو مسرت کی کیفیت بائرن پر طاری ہوتی ہے، وہ کیفیت دریائے سندھ کی طغیانی سے حاصل ہوتی ہے ؎

جامِ لبریز کی مانند چھلک کر دریا ۔۔۔ دُور تک اپنے کناروں سے پرے پھیل گیا
ہر طرف پانی ہی پانی کا جو نقشہ دیکھا ۔۔۔ مصرعۂ تر یہ کسی کا مرے لب پہ آیا

ہر کجا می نگرم عالمِ آب است ایں جا

●

ہو گئی اس درجہ مسرِ سطحِ زمیں وسعتِ آب ۔۔۔ کہ فلک مجھ کو نظر آنے لگا مثلِ حباب
آب در آب ہے، یا پانی میں ہے عکسِ سحاب ۔۔۔ نیچے اوپر ہے پانی کے نظارے ہیں جناب

ہر کجا می نگرم عالمِ آب است ایں جا

فطرت کے جمالی پہلو سے بھی محروم کا کلام خالی نہیں، اور دلکش مناظر کی مصوری میں بھی اُنھوں نے معیار بہت بلند کیا ہے۔ ان کی بہاریہ نظمیں بھی اپنے رنگ میں قابلِ تعریف ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا دامن کبھی ہوس اور شراب سے آلودہ نہیں ہوا۔ اُن کی ایک دلکش نظم میں شملہ کے مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ہی سے شاعر کی پاک نگاہی اور اخلاق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

رشکِ فردوس ہے محروم فضا شملے کی ۔۔۔ نفسِ حور سے بڑھ کر ہے ہوا شملے کی
چہرۂ شاہدِ فطرت نہیں مستور یہاں ۔۔۔ نہیں اے ذوقِ نظر! پردے کا دستور یہاں

راجہ اِندر کا اکھاڑا ہے یہ کہسار نہیں ۔۔۔ سبز پریوں کے نشیمن ہیں یہ اشجار نہیں

تعجب ہے کہ شعلے کی ہوش رُبا اور زاہد فریب فضا میں بھی محروم کی نگاہ ادب کو ملحوظ رکھتی ہے۔ نہ انھیں اس جنت میں کسی ارضی حور کی تلاش ہوتی ہے، اور نہ اُن کی نظر پردے کا دستور نہ ہونے کی وجہ سے بیباک ہوتی ہے، وہ راجہ اِندر کے اکھاڑے کا ذکر بھی کرتے ہیں تو صوفیانہ انداز میں۔ نہ رقص و سرود کا ذکر ہے، نہ کسی گُل بکاؤلی کا ذکرِ خیر۔ ایسے صبر آزما حالات میں بھی محروم نے معلّمِ اخلاق کی شان کو قائم رکھا ہے۔

انھوں نے جب شراب کا نام بھی لیا ہے تو یہی کہا ہے "نوجوانو! شراب سے بچنا!" لیکن از بسکہ شراب شاعری کے رگ و ریشہ میں سما گئی ہے "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" وہ فلکِ اخضری کو اپنا جام تصوّر کر لیتے ہیں۔ ان کی نظم کو پڑھئے اور پُرانی شراب کا لطف اُٹھایئے۔

اس کیف آور نظم میں میکشی کے سب سامان جمع ہیں اور پینے کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تھوڑی سی شرابِ خندۂ گُل ۔۔۔ رنگیں جس سے کہ ہو تخیّل
پیمانۂ برگِ ویاسمن میں ۔۔۔ یا ساغرِ لالۂ چمن میں
جس سے کہ خبر نہ ہو وہاں کو ۔۔۔ کر لیجیے تازہ کامِ جاں کو
صہبائے شفق کے جام دو جام ۔۔۔ پائی جس سے شرابِ گلفام

وہ بادۂ خوشگوارِ لعلیں عالم نظر آئے جس سے رنگیں
یا صبح کی وہ مئے نظارہ ہو جس سے چمک میں ماند تارہ
چپکے سے خموشیٔ سحر میں پی جائیے بس نظر نظر میں
خم خانۂ اخضرِ کہن کی جس میں ہو چمک دمک کرن کی
جامِ مہتاب سے چھلک کر چھینٹے چھینٹے گرے زمیں پر
ہر مست بقدرِ ظرف پی لے اور لطفِ سرور بیخودی لے
محروم بھی بہرہ یاب ہو جائے مستِ مئے فکر تاب ہو جائے

او ساقیٔ بزمِ مے گساری
کافی ہے مجھے یہ بادہ خواری

(فلکِ اخضری ہے جام مرا)

سچ ہے شاعری خود شراب کا اثر رکھتی ہے، جس کا دل و دماغ ہی شعر و مستی میں ڈوبا ہوا ہو اُسے شراب کی کیا حاجت ہے۔

"ادبی دنیا" لاہور
مارچ ۱۹۳۸ء
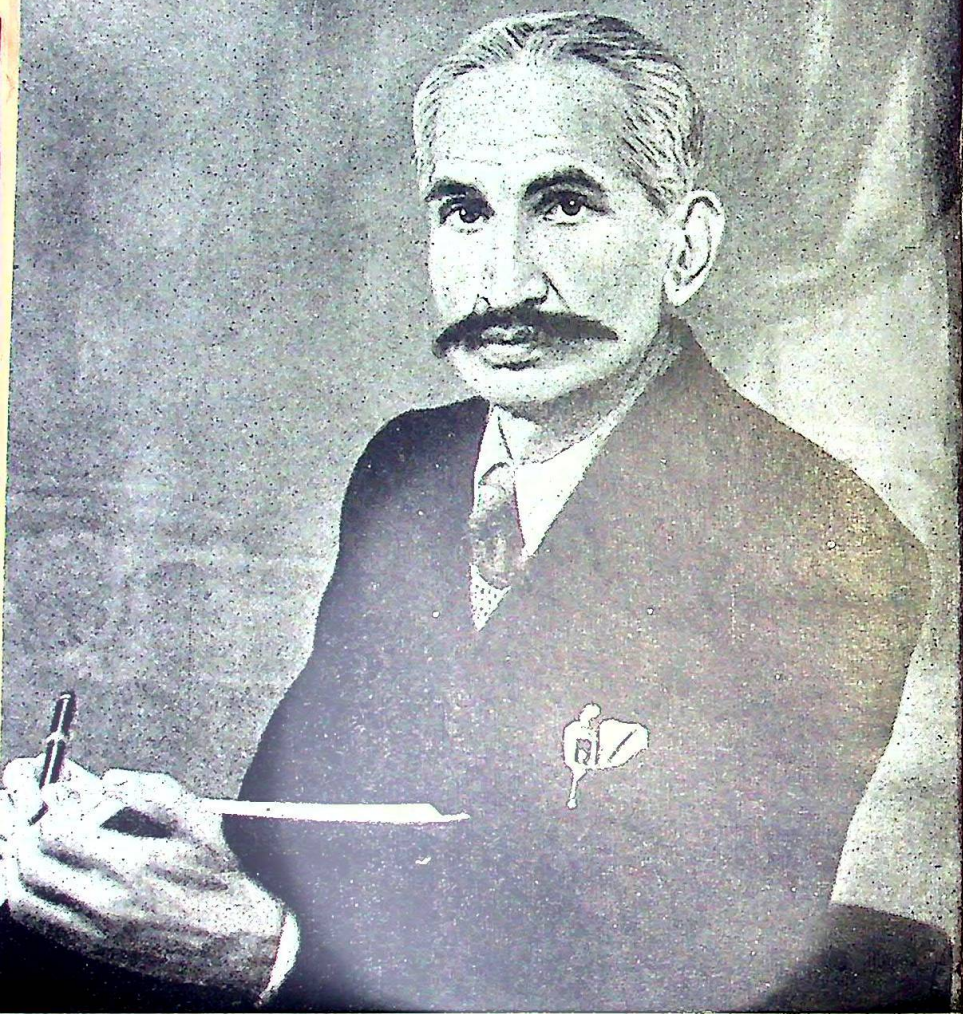
تاریخ ولادت :- یکم جولائی ۱۸۸۷ء　　　　تاریخ تصویر :- ۵ مارچ ۱۹۲۶ء

رباعی

در گنجِ رموز راہ نتوانم کرد　　　　بر کارِ فلک جز آہ نتوانم کرد

یکسر سرِ من سفید گردید و لے　　　　یک موئے ازاں سیاہ نتوانم کرد

دہلی - یکم دسمبر ۱۹۶۵ء　　　　تلوک چند محروم

رُباعیاتِ محروم

ممتاز حسن احسن

تلوک چند محروم کی رباعیات کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں لاہور سے طبع ہوا تھا۔ دوسرا ۱۹۵۴ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں بہت سی نئی رباعیات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن کا دیباچہ اورنٹیل کالج لاہور کے پروفیسر محمد اقبال مرحوم نے لکھا تھا۔ یہ دیباچہ دوسرے ایڈیشن میں بھی برقرار ہے۔ مگر طبع ثانی کے موقعہ پر علاّمہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے ایک اور دیباچہ لکھا ہے۔ دونوں دیباچے مختصر مگر جامع ہیں۔

جناب تلوک چند محروم اُردو کے اُن کہنہ مشق اور ریختہ گو اساتذہ میں سے ہیں جن کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کا کلام سند ہے اور بچوں

کی نظموں میں تو اُنھیں اسمٰعیل میرٹھی اور سورج نرائن مہر کا ہمسر کہنا چاہیئے ۔ اُنھوں نے ہر صنفِ کلام میں کچھ نہ کچھ کہا ہے ۔ مگر رباعیات کا یہ مجموعہ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت رباعی کے شاعرانہ تقاضوں سے خاص طور پر ہم آہنگ ہے ۔ رباعی غالبًا ایرانی الاصل ہے ۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ کہ جو رتبہ اس کا فارسی شاعری میں ہے وہ اُسے اُردو میں نصیب نہیں ہوا ۔ پروفیسر اقبال مرحوم نے اپنے دیباچے میں حالی اور اکبر الہ آبادی ، اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے میر انیس کی رباعیوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ مگر یہ امر مسلّم ہے کہ اُردو میں رباعیات کم مقبول ہیں ۔ اس کی وجہ ایک تو غالبًا رباعی کی بحریں مشکلات ہیں ، اور دوسرے یہ کہ رباعی کے لئے اختصار اور جامعیت دونوں چیزیں لازم ہیں ۔ شاعر کو اپنا سارا مضمون چار مصرعوں میں بیان کرنا ہوتا ہے ، اور جہاں تک مضمون کا تعلق ہے ، رباعی فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین سے ایک خاص مناسبت رکھتی ہے ۔ جناب محروم کی رباعیاں ان سب صفات سے مالا مال ہیں ، ان کا انداز بیان سادہ اور معنویت سے پُر ہے ۔ وہ بات کو پیچ دے کر کہنے کے عادی نہیں ہیں ۔ زبان پر اُنھیں وہ قدرت ہے کہ جو کہنا چاہتے ہیں بے تکلف کہے چلے جاتے ہیں ۔ اُن کے جذبات اور احساسات کو دل سے زبان پر آتے وقت تشبیہوں اور استعاروں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ، یہی وجہ ہے کہ ان کی بات دل سے نکل کر دل میں پہنچ جاتی ہے ۔ سر عبدالقادر

مرحوم کے انتقال پر انھوں نے ایک رباعی کہی ہو جو شاعر کے سچے جذبے کا آئینہ ہے۔

لاہور سے کیا بُری خبر آئی ہے
دنیا تاریک پھر نظر آئی ہے
رخصت ہوئے آہ شیخ عبدالقادر
دل ٹوٹ گیا ہے آنکھ بھر آئی ہے

پریم چند کی وفات پر جو لکھا ہے وہ بھی سنیئے۔

پائی تھی ادب کی جو سعادت تو نے
کی اُس سے وطن کی خوب خدمت تو نے
کیا ہم سے ہو پریم چند تیری توصیف
افسانے کو کر دیا حقیقت تو نے

کہئے اس سے سادہ، آسان اور موثر کلام کیا ہوگا۔ یہی سادگی اور یہی تاثیر ان کے اخلاقی اور فلسفیانہ کلام میں بھی موجود ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کُھلتا یہ راز علم و حکمت پہ نہیں
جب تک کرم خاص لعبادت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعد فکر بسیار
پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

دروازہ نجات کا بیاباں میں نہیں
دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکین جنت میں بھی نہیں مل سکتی
جب تک موجود قلب انساں میں نہیں

آئینہ دل کو گرد کیں سے رکھ صاف
کر دے اہل ریا کے کینوں کو معاف
دنیا میں نہ کر کسی سے بے انصافی
دنیا سے مگر نہ رکھ امید انصاف

محروم کی رباعیات میں اصلاحی پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ ان کی ساری زندگی

درس و تدریس اور اصلاح کے کاموں میں گذری ہے۔ اس لئے جب وہ نئی پود کو آزادی کے جذبے میں حد سے تجاوز کرتا دیکھتے ہیں تو اُن کو راہِ راست پر لانے کی کوشش اُن کے لئے ایک فرض بن جاتی ہے حسنِ نسوانی ان کے نزدیک ایک پاکیزہ چیز ہے۔ اور وہ اسے مغرب کی تقلید میں رسوا ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے۔

دورِ حاضر میں حسن کا یہ منظر — برقِ خاطف ہے خرمنِ غیرت پر
مثلِ رازِ قدیم مستورِ حیا — عشوہ ادبِ جدید ہے عریاں پر

تغیر پسند ہے زمانے کا مزاج — تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش — برہم زنِ ہوش حسنِ عریاں ہے آج

مجموعی حیثیت سے رباعیاتِ محروم" اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ کلام اُستادانہ ہی نہیں حکیمانہ اور مصلحانہ بھی ہے۔ ممکن ہے بعض رند مشرب طبیعتوں کو ان کے پند و نصائح گراں گزریں، مگر ان کے کلام کی شاعرانہ خوبیاں اتنی اور ایسی ہیں کہ ہر کسی سے خراجِ تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ اکبر الہ آبادی نے تلوک چند محروم کے متعلق بجا فرمایا تھا کہ ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

کراچی - ۳ فروری ۱۹۵۷ء

(ریڈیو پاکستان کراچی)

کلامِ محروم پر ایک نظر

کیلاش ماہر

اجتماعی اعتبار سے اگر شدید آرزو کے اظہار کا نام ہی شاعری ہے تو تلوک چند محروم کا کلام اُس پختہ زندگی کے ژولیدہ تجربات کا مجموعہ ہے جو اُردو ادب کے لئے ایک گراں مایہ سرمایہ ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اعلیٰ القسم کی شاعری کی تخلیق زندگی کے مسائل سے تصادم اور خارجی تجربات سے ہوتی ہے، یہ تصادم اور انتشار شاعری کی جان ہیں۔ اور یہی فکری عمل کے لئے شاعر کو آمادہ کرتے ہیں۔ محروم صاحب ازل ہی سے حسّاس دل لے کر آئے ہیں، ان کے شدتِ احساس کا اندازہ اُن کی نظموں اور رباعیوں کے عنوانات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ فطری مناظر کے علاوہ انسانی زندگی سے متعلق جتنے

عنوانات پر حضرتِ مخدوم نے طبع آزمائی کی ہے اتنے شاید جہاں تک اردو ادب کا میرا مطالعہ ہے اردو کے کسی دوسرے شاعر کے دیوان میں مشکل سے ملیں گے۔ ان عنوانات کے پسِ پشت ان کی اپنی زندگی کے وسیع تجربات اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ اُن کا ذاتی جدلیاتی ردِ عمل بھی کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتِ مخدوم نے توحید، معرفت، فلسفہ، مناظرِ قدرت اور پند و نصائح ایسی سنگلاخ زمینوں میں آبگینے تراشے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری کے الفاظ ہیں "ہر دور میں بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے زمانے کی کشاکشوں کا خودداری اور وقار کے ساتھ اشاروں میں اظہار کرے لیکن شعر کو پرو پیگنڈہ نہ ہونے دے۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاعر کی عظمت کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے اندر بغیر واعظانہ یا مبلغانہ دھن اختیار کئے ہوئے یہ احساس پیدا کرسکے کہ ان کو بھی اپنے زمانے کی مشکلوں اور پیچیدگیوں کا خود اعتمادی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔" مجنوں گورکھپوری کے یہ الفاظ بہت حد تک جنابِ مخدوم پر صادق آتے ہیں حضرتِ مخدوم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اگرچہ مخدوم صاحب کی زندگی کے ذاتی حالات کا مجھے بہت کم علم ہے۔ مگر جو کچھ اُن کے بارے میں سُنا یا پڑھا ہے اُس کی بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زندگی کی تلخیوں نے موصوف کے کلام میں تاثرات اور احساسات کے مختلف دلپذیر پہلو یکجا کردیے ہیں۔ تعلیمی اداروں کی وابستگی نے حضرتِ مخدوم کو صحیح معنی میں اُستاد بنا دیا ہے۔ ذاتی کشمکش اور اصولِ تصادم سے جو تجربات

انھوں نے حاصل کئے، وہ اپنے انداز میں اس خوبی سے نظم کئے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ کچھ رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا

ایک دوسری رباعی میں مذہب کی آفاقیت اور مقصد کو چار مصرعوں میں سمویا ہے ؎

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

"مایا" یا "مادیت" کا فلسفہ بہت پرانا ہے۔ اس نظمِ جہاں کی خوبی یہ ہے کہ ہم سب اِس عالمِ آب و گِل کی حقیقت سے آشنا ہوتے ہوئے بھی اس کے دامِ فریب میں گرفتار ہیں ؎

دنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے اِس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

حضرتِ جگر مرادآبادی کی یہ نظم

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

غالباً پانچ سات سال پرانی ہے، مگر جو بات جگر صاحب نے اس دور

میں کہی ہے وہ حضرتِ محروم شاید بہت پہلے کہہ چکے تھے ؎

انساں نے درندوں کے چلن سیکھ لئے — اطوارِ رضائے اہرمن سیکھ لئے

اپنے علم و ہنر پہ خوش ہے ناداں — بربادیِ دو جہاں کے فن سیکھ لئے

ایک اور مقبولِ عام رباعی ہے ؎

اُڑتے دیکھا جو طائرِ پرّاں کو — اُڑنے کی اُمنگ لے اڑی انساں کو

گولے برسا دیئے زمیں پر اس نے — پرواز نصیب جب ہوئی ناداں کو

اس قسم کی بیشتر مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن میں حضرتِ محرؔوم نے دین و دنیا، صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل پر قلم اُٹھایا ہے، اگرچہ اس تخئیل کی رُوح میں قنوطیت بسی ہوئی ہے، مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ تخئیل خالص مشرقی تہذیب اور معاشرت سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی مسائل اور فلسفہ کی چھاپ کلامِ محروم پر بہت گہری پڑی ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں اس پہلو پر وضاحت کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی۔ اتنا کہنا غلط نہ ہوگا کہ مناظرِ قدرت اور حمد و معرفت کی بیشتر نظموں پر اقبال کے تخئیل اور طرزِ بیان کا دھوکا ہوتا ہے۔

پند و نصائح کے عنوان سے حضرتِ محروم نے کئی نظموں میں گیتا کی تعلیم کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ مثلاً "خدا کی امانت" میں دیکھیے ؎

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

اسی تخیل کی دوسری کڑی "پُرانا کرتہ" ملاحظہ ہو ؎

یہ ترا جسم بھی کرتے کی طرح ہے غافل — اور اس کرتے میں ہم رہتے ہیں پنہاں ہو کر
یہ بھی اک روز اسی طرح پُرانا ہو گا — پھینک دیں گے اسے اور نکلیں گے عریاں ہو کر

فانی چولے سے محبت کرنا اور اس دامِ بلا میں گرفتار رہنا انسانی کمزوری ہے۔ تاہم رفتہ رفتہ اس محبت اور لگاؤ کو گھٹانا چاہیئے، تاکہ وقتِ آخر ہم شاداں شاداں اس پُرانے کرتے کو چھوڑ سکیں۔ یہی محروم صاحب کا پیغام ہے۔

حضرت محروم کے کلام میں جیا ہے وہ رباعیات ہوں، نظمیں ہوں یا غزلیات ہر جگہ ان کے اپنے تجربات اور خیالات بڑی کثرت سے طاری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شعراء کی عام روش سے ان کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اُن کی اکثر رباعیوں اور نظموں میں واعظانہ اور ناصحانہ دُھن ضرور شامل ہے، تاہم کلام کی دلکشی پر ناقدانِ ادب کی دو رائیں مشکل سے ہوں گی، تنقید نگاروں کا خیال کچھ بھی ہو کہ تلقین آمیز شاعری صحیح معنوں میں شاعری نہیں ہوتی، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "رباعیاتِ محروم" اور "گنجِ معانی" کے نصائح دلکش بھی ہیں حقیقت آمیز بھی اور افادی بھی۔ آنے والی نسلیں خصوصاً طلبا جن کے نصاب میں محروم صاحب کی نظمیں داخل ہیں ان نکات سے ضرور مستفیض ہوں گی۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی بات یاد آتی ہے، ۴۳ - ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا تو محروم صاحب کی

کئی نظمیں ہمارے کورس میں شامل تھیں، ان کی نظم 'پروانہ' اور 'طیلہ' آج بھی اسی طرح میرے ذہن پر طاری ہیں: 'پروانہ' کا یہ بند میرے استاد بڑے شوق و ذوق سے جھوم جھوم کے سنا کر پڑھاتے تھے،

دل میں پیدا ہمتِ پروانہ کر ـ ورنہ مرغِ شوق کا پروانہ کر
رازِ پنہانی کسی پر وا نہ کر ـ اپنی ہستی کی ذرا پروا نہ کر

دل کو تو پہلے جلا پھر آپ جل
عشق کا دعویٰ ہے تو چپ چاپ جل

حضرت محروم اردو ادب کے عظیم شاعر ہوتے ہوئے بھی شعراء کے "روایتی عادات و اطوار" سے بہت مختلف ہیں۔ اردو شعراء کے کچھ مخصوص انداز و عادات رہے ہیں جن کا اثر اُن کے کلام پر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اردو اور فارسی کے شعراء نے شراب کی مدح میں لاکھوں اشعار کہے ہوں گے اس کے خلاف حضرت محروم نے شراب کی اصلیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے نعرۂ جہاد بلند کیا جو اُس دور کے لئے بڑی بات تھی، "شراب" کے چند شعر نقل کرتا ہوں ؎

فریب دہر نے تدبیر جانستانی کی! ـ کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
جلا کے جوہر ادراک کو دھواں کردے ـ دماغ کو وہ ابالے کہ نیم جاں کردے
نہ حور ہے نہ پری کوئی پری ہر شیشے میں ـ رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

محروم صاحب نے شاعری کو بھی عاقلانہ اور واعظانہ نظریے سے دیکھا ہے۔ انھوں نے اپنے دل کو پاسبانِ عقل کا غلام بنائے رکھا ہے اس کے باوجود

ان کے کلام میں دلکش ترنّم اور نغمہ ریزی اور رعنائیت کی کمی نہیں ہے۔ غزلیات کے علاوہ نظموں، قطعات، رباعیات اور تضمینات میں بھی استادانہ فن کاری کے ساتھ ساتھ سرمستی اور رعنائی کی کیفیت موجود ہے۔

یوں تو کلامِ محروم اُردو ادب میں ہر نقطۂ نگاہ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، تاہم وہ کلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جو کیفیات اور تاثراتِ غم سے معمور ہے۔ کیفیتِ غم طاری ہونے کے دو اسباب میری سمجھ میں آتے ہیں، پہلے تو وہ جس کا تعلق محروم صاحب کی ذات سے ہے، جیسا کہ سر عبدالقادر کے الفاظ میں "اس پر بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے کہ شاعر سراپا درد ہو گیا۔ ان صدموں میں سب سے زیادہ اثر اُس جانکاہ زمانے کا ہے جب محروم کی جوان بیوی شادی کے چند سال بعد ہی ایک ننھی سی لڑکی کو چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی..." اپنی شریکِ حیات کی جدائی کا غم تو تھا ہی، اس پر فطرت نے بھی محروم صاحب کو پرسکون زندگی اور اس کے لذائذ سے محروم رکھا۔ ہمارے تعلیمی اداروں کی سرگزشت بہت تلخ رہی ہے۔ ممکن ہے حضرت محروم کو بھی ان تلخ تجربات کا بڑا حصّہ ملا ہو جنھوں نے اُن کے مزاج میں زندگی سے قنوطیت اور ناامیدی کے وہ تاثرات بھر دیے جن کا عکس جگہ بہ جگہ ان کے کلام پر پڑا۔ "گنجِ معانی" کا وہ حصّہ جو "طوفانِ غم" کے تحت لکھا گیا ہے غمِ دل کی سچی اور پرخلوص عکاسی ہے۔ "اشکِ حسرت" انسانی جذبات اور احساسات کی جامع تصویر ہے۔ جزئیات میں محروم صاحب کو خاص کمال حاصل ہے۔

'اشکِ حسرت' اور 'دردناک منظر' وہ پُرتاثیر نظمیں ہیں کہ پتھر کا دل بھی ان کو پڑھ کر اور غمِ محروم کا تصور کرکے ایک بار شدتِ کرب سے ضرور چیخ اُٹھے گا۔

حضرت محروم کا غمِ دل یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ "فصلِ بہار" "کنارِ راوی" "صحرا" کے علاوہ رباعیات، قطعات اور غزلیات میں بھی کئی جگہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے اگرچہ غم دوستی اور یاس پرستی اردو شعراء کی میراث رہی ہے لیکن کلامِ محروم میں دیگر شعراء کے مقابلے میں المیہ اور غم سے لبریز اشعار کی بھرمار نہیں ہے،

منظر نگاری اور فطرت نگاری محروم صاحب کی شاعری کے خاص جوہر ہیں منظر نگاری اعلیٰ شاعری کے لئے سنگِ بنیاد مہیّا کرتی ہے۔ محروم صاحب کی منظر نگاری رنگِ ماحول اور حالات کا ایک سماں پیدا کر دیتی ہے، اور فکر کی گہرائی ہمارے دماغوں کو متاثر کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر یہاں مثالیں پیش کی جائیں تو کم سے کم ایک الگ مقالہ مرتب ہو جائے گا۔ مختصر الفاظ میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ 'گنجِ معانی' میں ہم بیک وقت مختلف شعراء کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ "یادِ رفتگاں" کو پڑھنے کے بعد انیس کا کلام ہمارے ذہن میں اُجاگر ہو جاتا ہے" اور "جذباتِ فطرت" "مناظرِ قدرت" سے ہم روحِ اقبال کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ الفاظ کی بندش، طرزِ بیان، اور تشبیہات و استعارات کو دیکھنے سے محروم صاحب کی تلاش اور عمیق مطالعے کی داد دینی پڑتی ہے۔

دہلی - جون ۱۹۵۷ء

تلوک چند محروم کی شاعری

عبدالعزیز فطرت

رزم و بزم کی کیفیات ہوں یا مناظرِ فطرت کی نیرنگیاں، انسانی جذبات کی بیقراری ہو یا عناصر کی کشاکش، ان سب کی تصویرکشی میں جناب محروم کا قلم کہیں بھی کوتاہی کا شکوہ سنج نہیں، بہاروں کے ذکر میں رنگین الفاظ اور شگفتہ خیالات کے وہ چھینٹے دیے جاتے ہیں کہ دامنِ نظم کی گلکاری دامنِ بہار پر خندہ زن معلوم ہوتی ہے۔ خزاں کی داستان اُن کے وارداتِ قلبی سے قریب تر ہے، اور اس لئے اندوہ والم کا ذکر اکثر اُن خونیں آنسوؤں سے ہوتا ہے، جو زبان تو نہیں رکھتے، لیکن اپنی داستان نہایت اثر انگیز طریق پر بیان کر جاتے ہیں۔ نسیمِ صبح کی روانی کا ذکر لطیف آہستگی سے ہوگا۔ رقصاں ستاروں کی تصویر تابندہ

افکار کے آئینے میں دکھائی جائے گی تو آندھی کا ذکر کچھ ایسے پُرخروش انداز میں ہو گا کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو کسی طوفان ہی میں گھرا ہوا پائے گا۔ مثلاً

وہ گرد کا پہاڑ اُٹھا پھر شمال سے! | بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے | آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے

"بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے" کہہ کر طوفان کی لحظہ بہ لحظہ بڑھنے والی رفتار کا جس دلآویزی سے نقشہ کھینچا ہے وہ دوسرے الفاظ میں اور دوسرے شاعر کی زبان سے ناممکن تھا۔

ہواؤں کے مسلسل رُخ بدلنے اور گرد کے مسلسل مختلف صورتیں اختیار کرتے جانے کی کسی ساکن مثال سے گریز کر کے یہ کہنا کہ "یہ مثال سے باہر ہے" پڑھنے والے کا اشتیاق بڑھانا اور پھر یہ مثال دینا کہ چال ڈھال سے یہ جنّات کی فوج نظر آتی ہے۔ کمالِ فن کی ایک حسین عشوہ گری نہیں تو اور کیا ہے۔ میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ شاعر نے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے شوق میں بے قابو بگولوں کی ایک متحرک تصویر کھینچ دی ہے۔

اسی نظم میں جو "آندھی" کے عنوان سے چھپی ہے، صوتی کیفیات آندھی ہی کی طرح ساری فضا پر مسلّط معلوم ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھنکارتی | للکارتی زمیں کو فلک کو پکارتی
ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم اُبھارتی | اُڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اُتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی
ہلچل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی

آندھی کی بے پناہی جن بے پناہ الفاظ میں بیان ہوئی ہے وہ توصیف سے بے نیاز ہیں۔

شاعر کا ذہنِ رسا ہیبت ناک آندھی کے دمادم بدلتے ہوئے انداز کے ساتھ تاثرات کی نئی سے نئی دنیاؤں میں پہنچتا ہے۔ اس کا دیدۂ بینا اس جاوی کل باد گرد کے اندھیرے میں تمام واقعات دیکھتا ہے۔ تناور درختوں کا عناصر سے زور آزما ہو ہو کر جڑ سے اکھڑنا، چھجوں اور چھپروں کا اڑ اڑ جانا، دیواروں اور چھتوں کا گرنا، غرض ایک قیامت آفریں آندھی اپنی غیر ارادی دیوانگی کی رو میں جو جو کچھ کیے جاتی ہے محروم کا قلم بھی طوفان کی تیزی سے اس کا نقشہ کھینچے جاتا ہے۔ اہلِ زمین کی افتاد دیکھیے

چکر سے گرد باد کے چکرا گئی زمیں
دیکھا یہ زور شور تو گھبرا گئی زمیں
جھونکوں کے ساتھ اڑتی ہوئی آ گئی زمیں
بس اب کسی ستارے سے ٹکرا گئی زمیں

اس اضطراب کے عالم میں کہ ہر کرۂ زمیں کے کسی دوسرے کرہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کا دھڑکا ہے۔ زمین چکرائی اور گھبرائی ہوئی ہے اور آثارِ قیامت رونما، شاعر کی وسعتِ نظر ہمیں ایک نہایت اہم جز کی سیر کراتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کرنے لگے بچاؤ کی تدبیر ہوشمند

دیکھئے یہاں بچاؤ پر زور دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ نہیں بتائی کہ انھیں موت کا خوف ہے، کیونکہ انسان تو مصائب ہی کے لئے بنا ہے، اور مصائب انسان ہی کے لئے۔ اس کی وجہ فطرتِ انسانی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جو بیک وقت کمزوری بھی ہے، اور عقلمندی بھی، چونکہ ہوشمندوں کا ذکر ہے۔ ان کا کوئی اقدام بے وجہ نہیں ہو سکتا۔ بچاؤ محض دفاع ہے۔ اس میں جارحانہ مقابلے کا شائبہ نہیں، اور یہاں محض دفاع ہی فطرت کے مطابق تھا۔ کیونکہ ؎

تا بامِ چرخ جس کی رسائی ہو بے کمند
کس کی مجال ہے جو کرے اس کی راہ بند

آیئے! ہم جن حالات سے گزر آئے ہیں، اُن پر دوبارہ نظر دوڑائیں، آندھی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ہر سمت ایک سراسیمگی نظر آنے لگی، شجر بیچارگی کی تصویر بن گئے، اور

شاخوں میں چھپتے پھرتے ہیں طائر اِدھر اُدھر
مامن کی راہ دوڑ کے لینے لگے بشر
چوپائے بھانپ کر یہ مصیبت کہاں گئے؟
ان بیکسوں کے سینگ سمائے جہاں گئے

یہاں بیانیہ حسن کے علاوہ نازک معنی آفرینی اور انسانوں اور حیوانوں کے فطری احساسات کا مشاہدہ کس خوبصورتی کے ساتھ کارفرما ہے۔

اس کے بعد خیال کی رو سے کبھی تیز چلنے والی آندھی، اٹھ در صحرا کی طرح

پھنکارتی، زمین و آسمان کو للکارتی، ذرّوں کو چرخِ چہارم تک اُبھارتی اور آسمانی مخلوق کو زمین کے دامن میں اُتارتی، زمین و زماں میں ہلچل مچاتی آجاتی ہے، انسان مکانوں میں دبکے پڑے ہیں۔ لیکن ؎

چُھپ چُھپ کے لاکھ بیٹھئے کب چھوڑتی ہے یہ
دروازے کھٹکھٹاتی نہیں توڑتی ہے یہ

زہے نصیب کہ ہوا کی فطرت کو قرار نہیں، خدا کا شکر ہے یہ بلائے ہیبت‌ناک، جھکّڑ تھما، قہرِ خدا کا نمونہ دکھا کر شعلوں سے زیادہ تند خو ہوا اپنی طوفانی طاقتوں کا مظاہرہ کر کے کسی اور طرف کو روانہ ہو گئی، اور اُس کی یادگار اب یہ باقی ہے، کہ

صحرا کی طرح بند مکانوں میں گرد ہے

اب اگر اس ہیبت ناک طوفان کے متعلق آپ سے کہا جائے کہ یہ محض تمہید تھی، ایک شاعرانہ انکسار کے لئے تو شاید آپ یقین نہ فرمائیں گے، لیکن آئیے ہم آپ کو محروم کے وطن کی سیر کرائیں۔

یہ کلورکوٹ ہے، منزلوں ریت ہی ریت۔ سرو و گلبن تو کیا البتہ کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں اور آک کے پودے نظر آجاتے ہیں۔ مناظر کی رنگینی نام کو نہیں۔ ایسے ایسے طوفان جن میں سے ایک کا ذکر خود محروم صاحب نے کیا ہے، اچانک محیط ہو کر تمام لطیف احساسات کو گرد آلود کر جاتے ہیں، یہاں محروم

ایک لالۂ صحرا کی طرح اپنی بہار دکھاتے ہیں، اور شاہی کی طرح خون روتے ہیں، اور کہتے ہیں۔

افسوس میں ہوں اور یہ صحرائے ہولناک
اُڑتی ہے جس میں شام وسحر آسماں پہ خاک

اور اُن کا اس پس منظر کے ساتھ وہ انکسار کیا گیا ہے، جس کی تمہید یہ مُرصع نظم تھی۔

اِن خاک باریوں سے گئی وہ صفائے طبع
اب پھول کیا زمینِ سخن میں کھلائے طبع

لیکن ہم جانتے ہیں کہ انکسار ایک پردہ ہے، جو ہر قابل گوارہ زانی کی آنکھوں سے بچائے رکھنے کے لئے، ورنہ خود مرحوم صاحب ایک دریائی طوفان کی بابت فرماتے ہیں۔

جامِ لبریز کی مانند چھلک کر دریا دُور تک اپنے کناروں سے پرے پھیل گیا

میرے نزدیک اُن کا یہ شعر خود اُن کے اپنے ذوقِ سخن گوئی کی بہترین تصویر ہے۔

جامِ لبریز کی مانند چھلک کر دریا دور تک اپنے کناروں سے پرے پھیل گیا

ایسے منکسر المزاج شاعر کے کلام میں سے مجھے ایسے درخشندہ جواہر پارے منظرِ عام پر لانے ہیں۔ جو اگرچہ خود غم کی اتھاہ تاریکیوں اور نامساعد حالات کی ناقابلِ عبور

چٹانوں سے نکلے ہیں لیکن اپنے اندر غمگین دلوں کی تشفی کا بے پناہ سامان رکھتے ہیں، اور اندوہ و ملال کے سیاہ ماحول میں صبر دہی اور تسکین بخشی کی شمعیں بن کر داخل ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔

یہی نہیں، اپنے ایک ہم عصر مرحوم سرور جہاں آبادی کو جس لطیف انداز سے دادِ سخن دی ہے وہ بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی پھول اپنے قریب ایک اور پھول کو کھلا ہوا دیکھ کر مسکرانے لگے اور اپنے دامن کے قطراتِ شبنم دوسرے پھول کے قدموں میں ڈال دے۔

شاہدِ تحریر کا حُسنِ جانفزا دیکھے کوئی ۔۔۔ یا تری سحر بیں تیری ادا دیکھے کوئی
سازِ بزمِ راز کی سن کر صدا دیکھے کوئی ۔۔۔ ہے یہ کس کا نغمۂ رنگیں ادا دیکھے کوئی

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

اور پھر

نت نیا پردہ اُٹھا کر طلعتِ مستور کا ۔۔۔ اہلِ عالم کو دکھاتا ہے تماشا نُور کا

یا

جو طبیعت میں تری ہے گُل میں رنگینی کہاں ۔۔۔ شعرِ نازک کو ترے پہنچے بتِ چینی کہاں

اور جب اپنے وطن کی غلامانہ افتادِ پر مرحوم کا دکھتا ہوا دل اپنے اس ہم عصر کے دردناک کلام کو اپنے جذبات کے ساتھ ہم آہنگ پاتا ہے تو کہہ اُٹھتا ہے

کہ اگر ہم اس مصیبت میں بارگاہِ خداوندی میں نالوں کا ایک کاروان بھیجیں تو

تیرے نالوں کو بنادیں کاروان سالا ہم

یہاں بھی شرکتِ غم کا پہلو نمایاں پائیے گا۔ اور حق تو یہ ہے کہ غم ہی وہ جہاں گیر جذبہ ہے جو حلقۂ اخوّتِ انسانی کی بقا کا ضامن ہے۔

"موت" کے عنوان سے محروم صاحب نے جو نظم کہی ہے اُس کے پہلے ہی بند میں یہ مصرع کس قدر رقّت خیز ہے

خون سے لکھا ہوا ہے جو ترا افسانہ ہے

نیز

جو قافلہ ہے یاں سے عدم کو روانہ ہے

اور وہ جو انسان پر مصائب کا باعث آسمانِ کج رفتار کو قرار دیا جاتا ہے اس کی طرف کس لطیف پیرائے میں اشارہ ہوتا ہے۔

کچھ کچھ شریکِ جور ہے گو آسماں ترا
لیکن وہ دوں خصال بھی ثانی کہاں ترا

اور موت کا رتبہ ستم کی دنیا میں کتنا بڑھا ہوا ہے، ایک مصرع یہ بھی قیامت کا ہے۔

تجھ کو ذرا غمِ غمِ اہلِ جہاں نہیں

اور یہ مصرع بھی

تو برقِ بیخ سوز ہے باد خزاں نہیں

ہر چند کہ ان نظموں میں سے محض اقتباس دینا نظموں اور شاعر دونوں پر ظلم کرنا ہے، لیکن اختصار بہر حال مقصود ہے، اور میں صرف انہی بے پناہ تیروں کو چن چن کر نکال رہا ہوں جو دل میں پیوست ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی ماں سے اس کا بچہ چھین لینے پر موت کو بہت سی اور باتیں بھی کہی ہیں۔ لیکن یہ مصرعے دیکھیے۔

اے موت دیکھ طولِ زمانِ ملال دیکھ
ایسی بھی غمزدوں کی کہیں ہے مثال دیکھ

اور آخر میں

نورِ نظر کے غم میں یہ اتنا جو روئے گی
آنکھیں تو خیر جان کو اک روز کھوئے گی

یہ کتنے لاکھوں کروڑوں کے دل کی بات کہی ہے۔

"بوئے گُل" والی نظم کے پہلے تین شعر ہی لیجیے۔ کمالِ شعریت، بندش کی کسی، اور معنی کی لطافت تمام ایک نازک جسم سی بن کر رہ گئے ہیں۔ بوئے گُل سے خطاب ہے۔

فضائے دامنِ گُل ہیں ملا مقام تجھے
ہوا نصیب نہ لیکن وہاں قیام تجھے

بایں لطافت و جاں پروری و زیبائی
کیا بوقتِ سحر عزمِ دشت پیمائی

وطن سے دوشِ صبا پر سوار ہو کے چلی
چمن سے مشک فشاں عطر بار ہو کے چلی

اور نظم کے خاتمے پر اُس سے یہ کہنا کہ

ہے مجھ کو تیرے مقدّر پہ سخت حیرانی
جہاں کو مایۂ فرحت تری پریشانی

گویا ہر لطیف چیز سے یہ تقاضا ہے کہ وہ ایثار سے کام لے، اور دنیا میں کہ غم و اندوہ کی ظلمتوں سے تاریک ہو رہی ہے مسرتوں کی روشنی عام کرے۔ شاعر کی نظر کہاں کہاں ہے۔ مرحوم کا مطالعۂ فطرت نہایت وسیع ہے، صرف ایک پھول ہی کے آغاز و انجام پر جو نظم کہی ہے اُسی سے اس وسعتِ نظر کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔ آغاز و انجام کا حسین اور ناقابلِ تقلید موازنہ دیکھیے۔

آغاز مہِ مسرتِ تام	انجام شبِ سیاہِ آلام
آغاز طلوعِ صبحِ انور	انجام سوادِ آمدِ شام
آغاز نگاہِ لطفِ ساقی	انجام شکستِ شیشہ و جام
آغاز ہوائے شوقِ پرواز	انجام فریبِ دانہ و دام

آغاز وہ ہے کہ ہائے آغاز
انجام وہ ہے کہ وائے انجام

اور یہی آغاز و انجام کا تصوّر اُن کی کئی اور نظموں میں کہے ہوئے شعروں کا پس منظر ہے۔ سبزۂ نو سے کہا ہے۔

ارمانِ دیدِ گُل سے دھوکا ہوا ہے تجھ کو	لے کر عدم سے آئی تیری تفضّلے تجھ کو

اور عنوان کچھ بھی ہو، رازِ بقا و فنا کا پردہ کشا شاعر حکمت کے موتی بکھیرتی جاتا ہے۔

ہر اک کا مدعا ہے دنیا میں شادمانی	تیری طرح ہے عالم جویائے کامرانی

گل ہائے لطفِ دنیا ہر چند چیدنی ہیں	نظارہ ہائے عالم دلکش ہیں دیدنی ہیں

لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے

افسوس دل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے

"شمعِ سحر" والی نظم بھی کچھ ایسے ہی تاثرات لئے ہوئے ہے۔ اُٹھان ملاحظہ فرمایئے۔

محفل کا رنگ اُڑنے لگا شب بسر ہوئی	بزمِ نجوم حیرتِ رخ پہ زیر و زبر ہوئی

اور آگے چل کر

چمکا کبھی جہاں میں نہ تجھ کر شرارِ حسن	افسردگیٔ شمع ہے انجام کارِ حسن

اور اسی شمع کی بدنصیبی کا کس قدر دل گداز تصور یہ ہے۔

گذری شبِ عروج یہ صبحِ زوال ہے	تھا رات کو جو بدر وہی اب ہلال ہے

سیلابِ تا کمر ہے یہ اشکوں کا حال ہے	دھونا مگر نوشتِ جبیں کا محال ہے

بیتاب ہو رہی ہے اکیلی کھڑی ہوئی

قسمت کو رو رہی ہے اکیلی کھڑی ہوئی

پھر ایک مصرعہ یہ بھی ہے۔

یعنی فسانۂ غمِ ہستی دراز ہے

اور یہ شعر تو کتنا لاجواب ہے۔

بجلی گرائی صبح کی اک بے گناہ پر
ہے داغِ تازہ دامنِ چرخِ سیاہ پر

اور اگرچہ محروم صاحب نے اپنے آپ کو کبھی غزل گو شعراء میں شمار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ تغزل بے اختیار ان کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ اپنی نظم میں پروانوں کی طرف اشارہ کر کے شمع سے پوچھا ہے۔ تغزل کی پاکیزگی دیکھیے

کیا ہو گئے وہ ناز وہ انداز کیا ہوئے
وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے

شب بھر غریب تختۂ مشقِ ستم رہے
لیکن امیدوارِ نگاہِ کرم رہے
مر کر بھی راہِ عشق میں ثابت قدم رہے
جل کر گرے تو یار کے قدموں پہ شمع سے

ہیں مہربانیاں فلکِ دوں نواز کی
یوں منتشر ہو خاکِ شہیدانِ ناز کی

حوادث کی یورش نے محروم سے کبھی بے اعتنائی نہیں کی" اور اس کے صدقے میں محروم کا دل غم کے معاملے میں نہایت حساس اور ذکی واقع ہوا ہے۔ بلبلِ اسیر صیاد کا شکوہ کرتی ہے تو اس میں کس قدر حسرت محروم کے اپنے دل کی گہرائیوں سے نکل کر شامل ہو جاتی ہے۔

آتشِ حسرتِ گلگشت سوا ہوتی ہے
اُجڑے گلشن کی بھی کیا خوب ہوا ہوتی ہے

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ چمن کونسا ہے، اور تاراجِ چمن کا یہ شکوہ کس سے ہے، لیکن جو درد اس نغمۂ غم میں پوشیدہ ہے وہ ہر ایک کے دل کا درد ہے، اور اس اندوہناک نوا میں کروڑوں دلوں کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

یادِ ایّامِ بہاراں کہ چمن تھا ہم سے
اپنے جلسے بھی کبھی غیرتِ جشنِ جم تھے

اور یکایک

آگیا دامِ بلا دوش پہ لے کر صیاد

اور صیاد بھی کون، جس کی سرشت میں

نغمۂ بلبلِ شیدا سے فقط لاگ نہ تھی
کون سا برگ وہ تھا جس کے لئے آگ نہ تھی

جس کی چمن دشمنی کی ایک تصویر یہ ہے۔

جاں ستانی میں تامّل نہ توقف نہ درنگ

اور دوسری یہ کہ

ذبح کر ڈالے ہیں مرغانِ چمن گن گن کے

اُسی "دشمنِ مہر، جفا پیشہ، ستمگر صیاد" سے یہ شکوہ ہے کہ

بے خطاؤں پہ یہ غصہ یہ عتاب اے ظالم
کبھی دینا ہے خدا کو بھی جواب اے ظالم

زرِ گل دامنِ گلزار سے جھاڑا تونے
سبزہ بیگانہ تھا اس کو بھی لتاڑا تونے

نقشۂ حسنِ چمن آہ بگاڑا تو نے

اور چلتے چلتے یہ تغزل کی لطیف جھلک غم میں سموئی ہوئی دیکھتے جائیے۔

جل اٹھا پھول سے کیوں داغِ نہاں تھا کوئی
خار کھٹکا تری نظروں میں سناں تھا کوئی

کج ہوا سرو سے کیوں؟ غیرِ جواں تھا کوئی
لپکا سائے پہ عبث؟ اس میں نہاں تھا کوئی

خفقاں تھا یہ ترا جس نے ڈرایا تجھ کو
سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آیا تجھ کو

اس میں سائے پہ لپکنے والا ٹکڑا، اور سایۂ شاخِ گل کا افعی نظر آنا صیاد کی توہم میں ڈوبی ہوئی ظالمانہ سیرت پر کتنا سیر حاصل تبصرہ ہے۔

انسان خوشیوں سے کتنا جلد محروم کر دیا جاتا ہے۔ "یادِ ایام" کے عنوان سے ہر شاعر کے کلام میں گمشدہ راحتوں کا ذکر پایئے گا، لیکن اس سے مفر نہیں۔ خود محروم صاحب نے یہ کہا ہے کہ "یادِ ایام کامرانیٔ دل، درحقیقت ہے نوحہ خوانیٔ دل"، لیکن دل کی اس افتاد پر جو آنسو بہائے ہیں وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

وہ تپش یہ فسردگی افسوس
وہ خلش اور یہ بے حسی افسوس

شوق کے دن وہ ذوق کی راتیں
اب ہیں عہدِ گذشتہ کی باتیں

مہ و انجم سے ہمکلام کبھی
کشتۂ برق اوج بام کبھی

"ہمارا پنجاب" لاہور

جون ۱۹۴۷ء

تلوک چند محروم

مالک رام

جن لوگوں نے دنیا کے علم و ادب کا مطالعہ کیا ہے، انھیں خوب معلوم ہوگا کہ تقریباً تمام ممالک میں اوّل اوّل صرف نظم کا دور دورہ رہا، اور بعد میں نثر کا آغاز ہوا۔ آپ کسی زبان کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو اُس کے شروع میں نظم ہی لکھنے والوں کے نام نظر آئیں گے۔ بعض حالتوں میں تو نثر کا رواج نظم سے صدیوں بعد شروع ہوا۔ انسان نظم ان دنوں کہہ رہا تھا جب وہ ہوا میں اُڑتے طیور اور جنگل بیابان کے جانوروں کا شکار کر رہا تھا۔ یا جب وہ اپنے کھیت میں ہل چلا رہا تھا، اور اس کے کانوں میں بیلوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن کی آواز آ رہی تھی۔ اگرچہ وہ مولیئر کے مشہور کردار کی طرح اپنی روزمرہ زندگی میں نثر ہی بولتا تھا، مگر حسن و عشق اور

جِہُور وصولت کے جذبات کے لئے نثر ناموزوں تھی، ان جذبات کے اظہار کا ذریعہ صرف شعر تھا۔ اس کلیہ سے نہ آرین اقوام مستثنیٰ ہیں نہ سامی اور نہ حبشی۔

تہذیب و تمدّن نے جہاں اور کئی نئی نئی چیزوں سے انسان کو روشناس کرایا، وہاں نثر میں کتابیں لکھنا بھی سکھایا۔ شروع شروع میں یہ افسانوں کی حدود سے متجاوز نہیں ہوئیں، وہی مضامین جو اس سے پیشتر نظم میں لکھے جاتے تھے، اب ذرا شرح و بسط سے نثر میں لکھے جانے لگے۔ تاآنکہ ان میں تنوّع پیدا ہوا، اور دوسرے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا جانے لگا۔

مگر اس سے انکار ناممکن ہے کہ جس قدر انسان کے جذبات واقعی کی صحیح ترجمانی ان اشعار سے ہوتی تھی وہ نثر میں ممکن نہ تھی۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے کے اشعار تصنّع سے عاری ہوتے تھے۔ انسان کے پاس نہ کاغذ تھا، اور نہ قلم دوات۔ لوگ صرف اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے شعر کہتے تھے، کسی کی تحسین و آفرین کو اس میں دخل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں واقعیت زیادہ ہے۔ آپ نے کبھی عرب کے زمانۂ جاہلیت کی شاعری دیکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوہے سے لوہا بج رہا ہے۔ طوفانِ گرد و باد سے آسمان کے نیچے ایک اور آسمان چھا گیا ہے، تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑی ہیں اور نیزوں کے پھل مڑ گئے ہیں، پشتو کی پرانی شاعری کو دیکھئے وہاں بھی یہی حال ہے، پڑھتے ہی آپ کا خون جوش کھانے لگے گا، اُسی وقت کے شاعر صحیح معنی میں

"تلامیذ الرحمٰن" تھے۔ مادرِ فطرت اُن کی اُستاد تھی، اور اصلی جذبات اُن کے نقاد۔ ممکن ہے وہ ہمارے ساختہ و پرداختہ تنقیدی اصول کے مطابق نہ ہوں لیکن میرے نزدیک اُن کی قدر و قیمت ان اشعار سے کئی گنا زیادہ ہے جو ان اصولوں کے پابند تو ہیں، لیکن اصلیت سے عاری اور واقعیت سے مبرا ہیں۔

ممکن ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا یہ قول کہ "شاعری کو استادوں نے ڈبویا" بالکل صحیح نہ ہو، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ استادی شاگردی کے سلسلے نے شعر و سخن کو ایک کھلونا بنا دیا ہے، کسی استاد کو یہ کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ شاگرد نے کن جذبات سے متاثر ہو کر کوئی خاص شعر لکھا ہے۔ اس لئے جہاں جی میں آیا نظری کر دیا یا اپنے خیال کے مطابق اصلاح کر دی یا کوئی شعر اپنی طرف سے لکھ کر بڑھا دیا۔

منشی تلوک چند صاحب محروم ہی کو دیکھئے کہ پنجاب کے اُس ریگ زار میں پیدا ہوئے جسے عرفِ عام میں میانوالی کہتے ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ عیسیٰ خیل کے پہاڑی علاقے میں بسر کیا۔ عرصے تک کلور کوٹ میں مقیم رہے۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے، اور اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کا شوق ہے۔ لیکن آج تک کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا، تاہم کلام ایسا پختہ ہے کہ ان پر اہلِ زبان ہونے کا دھوکا گذرتا ہے۔ اب تک آپ کے کلام کے تین چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔ حال ہی میں چوتھا مجموعہ "گنجِ معانی" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں آپ کی

اخلاقی، ادبی اور نیچرل نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں۔

ایک شاعر اور عامی میں یہی فرق ہے کہ گو دونوں کی نظریں ایک ہی چیز پر پڑتی ہیں، مگر ایک کی نظر اُس کی سطح پر رُک کر صرف اُس کے ظاہری رنگ و بُو میں محو ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرے کی نگاہ اُس کی کُنہ تک پہنچتی ہے جس سے متاثر ہو کر ایک کُلّیہ کا استنباط کرتی ہے۔ ابتدائے تمدّن سے لے کر آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب خدا کی ہستی کا اقرار کرنے والوں کے ساتھ ہی منکروں کا گروہ بھی موجود نہ رہا ہو۔ ان لوگوں کو کئی کئی دلیلوں سے ہستیٔ باری تعالیٰ کا ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر غالبًا سب سے زیادہ مدلّل و مسکت جواب خود یہ دنیا و ما فیہا ہے۔ کیونکہ

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اگر انسان اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر غور کرے تو اُسے یقین ہو جائے گا کہ ان اشیائ کو پیدا کرنے والا بھی ضرور ہے، جو ان سب کو ایک اصول کے تابع پیدا کرتا ہے، قائم رکھتا ہے، اور بالآخر فنا کر دیتا ہے۔ مرحوم بھی خدا کی ہستی کے متعلق اسی طرح استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فلک پہ مہر و مہ پُر ضیا کے جلوے ہیں ۔۔۔ زمیں پہ لالہ و گل کی ادا کے جلوے ہیں
بتانِ مہر وش و مہ لقا کے جلوے ہیں ۔۔۔ قسم خدا کی! غضب کے بلا کے جلوے ہیں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

بتاؤ مہر منوّر میں نور کس کا ہے؟ ۔۔۔ میانِ انجم تاباں ظہور کس کا ہے؟

دماغِ فلسفی! تجھ میں شعور کس کا ہے؟ یہ تجھ میں اے دلِ شاعر! سرور کس کا ہے؟

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

ساری نظم میں اسی طرح ایک ایک چیز کا نام لے کر پوچھتے ہیں، بتاؤ اس میں کیا ہے، اُس میں کس کا جلوہ کارفرما ہے، اور آخر خود ہی جواب دیتے ہیں، خدا کے جلوے ہیں۔ آخری دو بند ہیں:۔

چمن میں، دشت میں، وادی میں، کوہ و صحرا میں
گہر میں، اولے میں، شبنم میں، ابر و دریا میں

شرر میں، شعلے میں، آتش میں، برقِ سینا میں
شمیمِ گُل میں، نسیمِ مسرت افزا میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

اُسی کے جلوے ہیں سارے، جو چشمِ بینا ہو
تمام ذرے ہیں تارے، جو چشمِ بینا ہو

وہ روبرو ہے ہمارے، جو چشمِ بینا ہو
بشر زباں سے پکارے، جو چشمِ بینا ہو

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

میں جب یہ نظم پڑھ رہا تھا تو مجھے قرآن کی سورۂ رحمٰن کا وہ مقام یاد آ گیا، جہاں سینکڑوں کو خدا کی مختلف نعمتیں ایک ایک کر کے گنائی گئی ہیں، اور ہر ایک چیز کا ذکر کرنے کے بعد یہ سوال کیا گیا ہے کہ تم اپنے خدا کی کون کون سی نعمت سے انکار کرو گے؟ وہاں اوّل دنیا کی چیزوں سے استدلال ہے، پھر آخرت کی، الغرض اسی طرح ہر ایک آیت کے بعد اس سوال کو غالباً اکیس[۲۱] بار دُہرایا گیا ہے۔

محروم "ماہِ تاباں" پر نظم کہہ رہے تھے کہ پھر یہی خیال آ گیا کہ آہ نادان

ہیئت داں اسے محض اپنی دماغی کاوش کی آسودگی کے لیے ہی دیکھتا ہے، حالانکہ اس میں عبرت و بصیرت کے متعدد مقامات ہیں۔ یہ خیال آتے ہی فرماتے ہیں۔

دیکھتا ہے کس نظر سے آہ ہیئت داں تجھے
وہ بنا دیتا ہے ظلم خطۂ ویراں تجھے
کیوں بنائے اک معلّق گول کوہستاں تجھے
اُس کے کہنے سے مگر کیا اے مہِ تاباں تجھے

اس کی باتوں سے تری رونق بھلا کیوں کر ہو ماند
وہ مثل ہے "خاک ڈالے سے کہیں چھپتا ہے چاند"

تجھ کو یہ الزام بھی ملتا ہے اے دشمن عذار
روشنی مانگی ہوئی ہے حُسن تیرا مستعار
ان کے طعنوں سے نہ کر تو اپنے دل کو داغدار
ہاں اسی قانون پر ہے سارے عالم کا مدار

وہ بھی لیتا ہے کسی سے، جس سے تو لیتا ہے نُور
اور ہے وہ نُور والا، سب کو جو دیتا ہے نُور

آخری بند میں دیکھئے کس دردناک لہجے سے رویتِ حق کی آرزو ظاہر کی ہے۔

تو کدھر ہے آہ! اے حسنِ ازل کے ماہتاب
تا کجا اوڑھے رہے گا منہ پہ دامانِ سحاب
خانۂ دل ہو نہ جائے اس اندھیرے میں خراب
ڈال دے کوئی شعاعِ شفقت آلودہ شتاب

تیرے جلوے کاش! ہو جائیں قریبِ چشمِ دل
خوابِ غفلت ہو نہ پھر ہرگز نصیبِ چشمِ دل

"انجامِ گل" کا آخری بند ہے۔

آغاز مہ مسرتِ تام
انجام، شبِ سیاہِ آلام

آغاز، شگفتنِ گلِ تر — انجام، نثارِ حسنِ گلفام
آغاز، طلوعِ صبحِ انور — انجام، سوادِ آمدِ شام
آغاز، نگاہِ لطفِ ساقی — انجام، شکستِ شیشہ و جام
آغاز، وہ عہد ہے کہ جس کا — سب جانتے ہیں طفولیت نام
انجام، وہ دَور ہے کہ جس کو — کہتے ہیں ہے بد ترین ایّام
آغاز، ہوائے شوقِ پرواز — انجام، فریبِ دانہ و دام
آغاز وہ ہے کہ ہائے آغاز! — انجام وہ ہے کہ وائے انجام

اور یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد شاعر پیغمبر بن کر کہہ اُٹھتا ہے۔

آغاز، انجام دیکھ گُل کا — نقشہ ہی جان جزو و کُل کا

"شمعِ سحر" کا بجھنا ہر ایک کو بے چین کر دیتا ہے، حسّاس طبیعتوں کے لیے اس میں بھی سامانِ بصیرت ہے۔ شاعر اس نظارے کو دیکھتا ہے، اُس کے دل میں کیا کیا خیالات اُٹھتے ہیں جنھیں وہ کس قدر زور دار الفاظ میں ادا کرتا ہے۔

محفل کا رنگ اُڑنے لگا، شب بسر ہوئی — بزمِ نجوم چرخ پہ زیر و زبر ہوئی
آخر حیاتِ شمع، چراغِ سحر ہوئی — منہ فق ہے، رنگ زرد ہے، حالت تبہ ہوئی

کرتا جہاں سے کوچ ہے گویا حسیں کوئی
بیمار لے رہا ہے، دمِ واپسیں کوئی

چہرے پہ مُردنی ہے، کہاں ہے بہارِ حسن — مثلِ بقائے گل نہیں کچھ اعتبارِ حسن

چمکا کبھی جہاں میں نہ بجھ کر شرارِ حسن　　　افسردگیٔ شمع ہے انجامِ کارِ حسن

مانندِ عشق، حسن بھی حسرت مآل ہے

شمعِ سحر کو دیکھ لو روشن مثال ہے

•

اے شمع تیری رونقِ بازار کیا ہوئی؟　　　گرمیٔ ذوق و شوقِ خریدار کیا ہوئی؟

وہ آب و تابِ جلوۂ رخسار کیا ہوئی؟　　　وہ شب کدھر؟ وہ بزمِ پرانوار کیا ہوئی؟

کیا ہو گئے وہ ناز، وہ انداز کیا ہوئے؟

وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے؟

شاعر کا دل تجلّیاتِ فطرت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہر شئے سادہ جو اپنے منبع کے قریب ہے، اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ مناظرِ قدرت، اجرامِ فلکی، معصوم بچے، شاعر کے دل کو موہ لیتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر وہ کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتا ہے، بچّوں نے شروع ہی سے اپنی توتلی زبان سے وہ وہ رازہائے سربستہ ان شاعروں کو سنائے ہیں جنھیں عوام سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مخدوم نے اپنی نظم "بچّہ" کی ابتدا کس انداز سے کی ہے کہ ورڈزورتھ ملک الشعرائے انگلستان یاد آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں،

اے کہ اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تو　　　کس وطن کی یاد میں روتا ہوا آیا ہے تو؟

کونسی دنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟　　　رونے والے! یاد کس کس کی رُلاتی ہے تجھے

کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تو؟　　　گلشنِ فردوس سے منہ موڑ کر آیا ہے تو؟

یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظارے تجھے
اجنبی ہے اس جہاں کے نقش ہیں سارے تجھے

کس لئے حیرت سے یوں ہر اک کا منہ تکتا ہے تو؟
کچھ تو کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں سکتا ہے تو

ہم کو بھی معلوم ہے، تو ہے مسافر دور کا
مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے ناآشنا

ہاں بتا وہ سرزمینِ عافیت تھی کون سی؟
بستی ہے دل میں ترے دلخواہ بستی کون سی؟

لیکن شاعر کے دل میں رہ رہ کر جو خیال اُٹھ رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بچّہ جو آج اپنے وطنِ عزیز کو چھوڑ کر آیا ہے، غمگین ہے، افسردہ ہے اور روتا ہے۔ مگر کل جب دنیائے فانی اس کے گرد اپنی رنگین امیدوں اور سنہری آرزوؤں کا جال بچھا دے گی تو اگرچہ وہ جال تارِ عنکبوت سے زیادہ مضبوط نہ ہوگا، لیکن اس سے ٹوٹ نہ سکے گا، اور نہ یہ اسے توڑنا چاہے گا۔ یہاں اس کی کوئی اُمیّد بر نہ آئے گی، بلکہ کتنی آرزوئیں ہی خاک میں مل جائیں گی۔ اس پر بھی یہ اس دنیا کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوگا، اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

آہ! اے نو واردِ ہستی! تجھے معلوم کیا
انقلاباتِ زمانہ ہیں مچاتے دھوم کیا؟

آج روتا ہے تو جس دنیا کو زنداں جان کر
کل نہ چھوڑے گا اسی کو باغِ رضواں جان کر

اس قدر مانوس ہو جائے گا اس دنیا سے تو
پھر وطن کی یاد ہوگی، اور نہ اس کی آرزو

یاد بھولے سے نہ آئے گا تجھے اپنا وطن
تو سمجھ لے گا اسی غربت کو ہی پیارا وطن

حاصل اک دن بھی نہ ہوگا گرچہ اطمینانِ دل
پھر بھی دنیا ہی رہے گی شاملِ ارمانِ دل

اس دنیا کو "بچے کی غربت" کہنا محرومی کا حصہ ہے۔

بعض نظمیں ایسے والہانہ انداز میں کہی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے شاعر بیخود ہے، اور دنیا کو بیخود بنا دینا چاہتا ہے۔ ایک سرور ہے جو اُس کے عضو عضو پر چھایا ہوا ہے، اور دنیا کا ذرّہ ذرّہ اسی کیف میں رنگا نظر آتا ہے، وہ خود جھوم رہا ہے، اور اُس کے گرد و پیش کی ساری فضا بھی جھوم رہی ہے۔ لکھتے ہیں، ذرا الفاظ کا ترنّم اور روانی ملاحظہ ہو۔

۱

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی
عطر اُڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

۲

صحنِ چمن سے چلی چھیڑتی اشجار کو
برگ و گل و خار کو

وصل کے ایام کا بلبلِ بیمار کو
مژدہ سُناتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

۳

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی
صبر اُڑاتی ہوئی
پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی
درد اُٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

ایک دوسری نظم ہے۔

پھر گلشنِ عالم میں پیغامِ بسنت آیا
پھر گونجتے ہیں نغمے مسرور فضاؤں میں
اک کیف کا عالم ہے صحرا کی ہواؤں میں
رعنائیِ دلکش ہے پھولوں کی اداؤں میں
بیتابیٔ الفت ہے بلبل کی نواؤں میں
بلبل کی نواؤں نے
ہر ذرّے کو تڑپایا

"پنجاب کے میدان" کے نام سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں وہاں کے میدانوں اور سبزہ زاروں کا ذکر کر رہے ہیں کہ حسن و عشق کے اندمٹے دیوتا کے وہ کھیل یاد آجاتے ہیں جو ان وادیوں میں بارہا کھیلے جا چکے ہیں، دل میں کسک اٹھتی ہے اور آہ بھر کر رہ جاتے ہیں، مگر چونکہ خود پٹھان ہیں، وہ ایام یاد آجاتے ہیں، جب یہ زمین فرزندانِ وطن کے خون سے رنگین تھی جنھوں نے اپنی جان ہنستے ہنستے جان آفریں کے سپرد کر دی، مگر میدان سے منہ نہ موڑا، اور پشت پر زخم کھانا گوارا نہ کیا۔

کس قدر ہے آہ! دامنگیر دل تیری زمیں — دلکشی پنجاب! کتنی تیرے میدانوں میں ہے
تیری رفعت میں ہوئی گم رفعتِ چرخِ بریں — ایک ایوانِ فلک بھی تیرے ایوانوں میں ہے

•

عاشقی پرور سماں تیری چراگاہوں میں ہے — یاد جس سے تازہ ہو رانجھے کی اور مہینوال کی
اور غبار آگیں سا منظر دشت کی راہوں میں ہے — خاک اڑتی ہے یہ عشاقِ پریشاں حال کی

•

دل تڑپ اٹھتا ہے پہلو میں یکایک جب کہیں — بانسری کی کوک اٹھتی ہے سکوتِ شام میں
مائلِ فریاد ہوتا ہے، دلِ اندوہ گیں — اور دل سے ہوک اٹھتی ہے سکوتِ شام میں

آخری بند ہے۔

حسن و الفت ہی نہیں ہے تیری شانِ امتیاز — گلشن سا میداں ترا ہے جو نہیں میدانِ جنگ
جذبۂ حبِ وطن پر خاک کو تیری ہے ناز — سورماؤں کے لہو سے آج تک ہے لالہ رنگ

محروم نے وقتاً فوقتاً اپنے معاصرین و متقدمین کے انتقال پر مرثیے بھی لکھے ہیں۔

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنؤ کا وہ شیوا بیان شاعر اور جادو نگار نثار تھا، جس کے زورِ قلم کے آگے بڑے بڑوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا، جن لوگوں کو معرکۂ چکبست و شرر یاد ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میدان میں فتح کا سہرا اسی نوجوان کے سر رہا تھا، اگرچہ مقابل میں شرر ایسا نامور ادیب اور کہنہ مشق انشاء پرداز تھا، ان کی جوانمرگی کا کس کو رنج نہ ہوا ہوگا۔ محروم نے بھی ایک دردناک نوحہ لکھا ہے، دو ایک بند درج ذیل ہیں۔

شہیدِ جلوۂ معنی وہ خوش خصال رہا سخن طرازوں میں چکبست بے مثال رہا
کہ شمعِ انجمنِ دانش و کمال رہا متاعِ سوزِ قدیمی سے مالا مال رہا

مٹا دیا اُسے سفاک نے، مٹانا تھا
کہ زد پہ تیرِ اجل کی بڑا نشانا تھا

ہوا میں گونجتے ہیں نغمہ ہائے حُبِّ وطن خموش اگرچہ ہوا وہ فدائے حُبِّ وطن
کہ ماتمی ہے سوادِ فضائے حُبِّ وطن نہ کیوں مناظرِ حسرت دکھائے حُبِّ وطن

وطن کو تیری ضرورت تھی آہ! اے چکبست
چلا ہے لے کے عدم کی تو راہ! اے چکبست

غالباً محروم کو اُن سے ذاتی تعارف نہ تھا، دل میں آرزو تھی کہ جب کبھی لکھنؤ جانا

ہوگا، ملاقات کریں گے، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، دیکھئے آخری بند کس قدر حسرت ناک ہے۔

زباں پہ جب کبھی آتا تھا لکھنؤ کا نام
تو اس خیال سے ہوتا تھا خوش دِل ناکام
کبھی تو آئے گی ایسی سعادتِ ایّام
ملیں گے حضرتِ چکبست سے بشوقِ تمام
ملیں گے اب بھی، مگر آہ! کب؟ کہاں؟ کیونکر؟
یہ راز اپنی نگاہوں سے ہے نہاں یکسر!

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی اور منشی نادر علی خاں نادر کاکوری کے مرثیے بھی لکھے ہیں، مگر ان سب سے زیادہ دردناک وہ نظم ہے جو نور جہاں بیگم جہانگیر کے مزار کنارِ راوی کو دیکھ کر لکھی ہے بعض بند ملاحظہ ہوں۔

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدّت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہُوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کُٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

کئی مسدس سے ایک یاس کا عالم آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے، خاتمہ کا بند ہے۔

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر، نہ ایواں آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَارْ! مگر سب سے دردناک مرثیہ وہ ہے جو طوفانِ غم کے نام سے محروم نے اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات کی وفات پر لکھا ہے جس میں جذباتِ انسانی کی صحیح تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کی نسبت مشہور ہے کہ انھوں نے ایک بار ایک شاعر کا لکھا ہوا مرثیہ پڑھا، جو اس نے اپنے بھائی کی وفات پر لکھا تھا۔ مرثیے کا ایک ایک مصرع درد و الم کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو خیال آیا کہ اس سے اپنے بھائی کا مرثیہ لکھواؤں، حسب الحکم شاعر نے مرثیہ لکھا۔ مگر اس میں وہ زور کہاں۔ حضرت عمرؓ نے بھی کہا کہ بھئی ان اشعار میں وہ بات نہیں، اتنا دردناک بھی نہیں۔ شاعر کا جواب لکھ رکھنے کے قابل ہے۔ کہنے لگا، اے امیر المومنین! مرحوم آپ کا بھائی تھا، میرا تھوڑا ہی تھا کہ میرے دل میں بھی وہی درد ہوتا جو آپ کے دل میں ہے۔ یہاں بھی چونکہ محروم صاحب کے دل کو لگی تھی، ایسے پُر درد مصرعے نکلے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے شاعر دل و جگر پانی کرکے آنکھ کی راہ نکال رہا ہے۔ لکھتے ہیں۔

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری! | ہے بے طرح متر شح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمھاری وہ طرزِ غمخواری | کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی؟
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی؟

ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف | چلے ہو تاروں کی چھاؤں میں کیوں عدم کی طرف
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف | بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف

مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

اسی سلسلے کی ایک دوسری نظم "ناپائدار رشتے" کے عنوان سے ہے جس میں فرماتے ہیں۔

کتنے ہی استوار رہوں ٹوٹیں گے ایک دن | رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
یہ مادر و پدر، زن و فرزند و اقربا | شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں
سنتے نہیں کہ بندۂ غفلت بگوش ہیں | نقّارے گرچہ زج رہے سر پر قضا کے ہیں

آخری چار مصرعے کتنے یاس انگیز ہیں، معلوم ہوتا ہے شاعر نے ان میں ایک دریائے غم بند کر دیا ہے۔

محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم | جو کچھ ہے چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی | اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

کتنا بلیغ کلام ہے، اسی سے متعلق ایک قطعہ بھی قابل دید ہے۔

بظاہر ہو چکا ماتم کسی کا ہوئے رو پیٹ کر خاموش آخر
دل بیتاب ہے اور غم کسی کا مگر دنیائے فانی میں ہوں جب تک

اس بے وقت موت نے شاعر کو ایسا درد آشنا کر دیا ہے کہ کوئی موقع ہو، کوئی تقریب ہو، اس کا زخم دل ہرا ہو جاتا ہے۔ کنارِ راوی ہے، مگر شاعر کو یہاں بھی سکون و قرار نہیں۔

اُڑ چلے طائر آشیانوں کو ملا آرام باغبانوں کو
نغمے یاد آئے نغمہ خوانوں کو کیا کروں سُن کے میں ترانوں کو

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

خواہ چرواہے خواہ چرپائے شوق سے اپنے گھر کو پھر آئے
خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے کیا کرے؛ ہائے! کوئی تبلائے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

ایک دوسری نظم "نسیم بہار" کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

جب پرتوِ سحر سے ہو روش طبق طبق اور رنگِ گل سے صحنِ گلستاں شفق شفق
دفتر ہو عیش کا گُلِ تر کا ورق ورق ہو بے حجابیوں سے تری گُل عرق عرق

تو کشتگانِ ہجر کو چھیڑے نہ اے نسیم
زخم کہن کے بخیئے اُدھیڑے نہ اے نسیم

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

آمدِ گُل کا ہم کو کیا احساس — دل ہے پہلو میں کب سے کشتۂ یاس
یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس — ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک
برگِ گُل اور نوکِ خار ہے ایک

غرض اسی طرح جا بجا آپ بھی رونے لگتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں۔
"سیرِ گلستاں" کے عنوان سے مرحوم نے گلستانِ سعدی کے بعض ٹکڑے اُردو میں ترجمہ کئے ہیں۔ یہاں پر اُن میں سے بھی چند ہدیۂ ناظرین ہیں۔

(۱)

نہیں ہے مرد وہ دانا کے نزدیک — لڑائی جو کرے پیلِ دماں سے
حقیقت میں وہی ہے مرد پورا — جو غصے میں نہ بولے بد زباں سے

(۲)

کافوری شمع دن کو جلائے جو بیوقوف — ہوگا نہ شب کو تیل بھی اُس کے چراغ میں

(۳)

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب — اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہدیں کہ نہ آؤ

(۴)

پیچھے جو تجھ کو چھوڑ چلا وہ شخص ترا ہمراہ نہیں
مت اُس سے لگا تو دل اپنا جس شخص کو تیری چاہ نہیں

"نکاتِ شیکسپیئر" کے عنوان سے اس نامور شاعر کے بعض اشعار کا کس قدر سلیس و سلسلہ وار ترجمہ کیا ہے کہ ترجمے کا گمان تک نہیں گزر سکتا۔

(۱)

قسمیں کھاتے ہیں واعظانِ معبد — کردار سے مختلف ہے جن کی گفتار
یا کھاتے ہیں بزدلانِ بیکس قسمیں — یا وہ جنھیں جانتی ہے دنیا عیّار
یا وہ جو ہیں ناتواں دل و کم ہمّت — دانستہ جو رہتے ہیں مصائب کا شکار
قسموں سے سنائی جاتی ہیں وہ باتیں — لوگوں کو سچائی سے ہو جن کی انکار

(۲)

دیو کی طاقت تنِ انساں میں ہے — بے گماں سرمایۂ صد افتخار
اس کا استعمال لیکن مثلِ دیو — آدمی کے واسطے ہے ننگ و عار

(۳)

وہی شبنم جو غنچے پر مثالِ گوہرِ غلطاں — نظر آتی تھی اِترائی ہوئی خود اپنی قسمت پر
برنگِ اشکِ چشمِ شاہدِ گل میں نمایاں ہو — کوئی ہو اشک ریزاں جس طرح اپنی مذلت پر

(۴)

کیا عجب بہرِ مدعا شیطاں — بن کے آجائے حافظِ قرآں

(۵)

غم سے اکثر ٹوٹتا ہے وقت و موسم کا نظام　　شام ہو جاتی ہے صبح اور صبح ہو جاتی ہے شام

(۶)

جب کہ اندازِ محبت میں زوال آتا ہے　　طورِ اخلاص تکلف سے بدل جاتا ہے

یہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے، مگر لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ اب میں اس مضمون کو حضرت لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کی ایک رباعی پر ختم کرتا ہوں، جس میں اُنھوں نے کلامِ محروم پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم　　لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز　　ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

"زمانہ" کان پور

جون ۱۹۳۴ء

محروم اور اُن کا کلام

اقبال ورما سحر

مثل مشہور ہے کہ شاعری کا ملکہ وہبی ہے، اکتسابی نہیں۔ ع

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ شاعر ہونے کے لئے کسی خاص ماحول کی ضرورت نہیں۔ ماحول شاعر کو نہیں، شاعر ماحول کو تبدیل کر سکتا ہے۔ ماحول کتنا ہی بے لطف اور غیر دلچسپ کیوں نہ ہو شاعر اپنی ذات کے جادو سے ایک ایسی فضا قائم کر لیتا ہے کہ گرد و پیش کی ہر شے اچھوتی معلوم ہونے لگتی ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اُردو کے مشہور و معروف

شاعر منشی تلوک چند محروم پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ محروم دسمبر ۱۸۸۵ء میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں[1] میں پیدا ہوئے جو تحصیل عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی (سابق بنوں) میں شامل تھا۔ وہاں ادب اور شاعری کا نام ونشان نہ تھا۔ کسانوں کا گاؤں تھا، کسانوں کی آوازیں اور کسانوں ہی کے گانے تھے۔ البتہ ذوقِ سخن کو نکھارنے کا سارا سامان ضرور موجود تھا۔ نیچے ہرے بھرے کھیت، گھنے باغ، صاف ہوا اور نرم رو بہتا دریا۔ اوپر کھلا ہوا آسمان، جگمگاتا ہوا سورج، چمکتا ہوا چاند، اور ٹمٹماتے ہوئے ستارے تھے۔ شاعر نے اپنا بچپن انہی قدرتی نظاروں میں گزارا، انہی سے اس کے قلب و نظر کی جلا ہوئی۔ انہی سے اُس نے دیکھنا، سمجھنا، اور کہنا سیکھا، مختصر یہ کہ قدرتی نظارے محروم کے ظاہر و باطن کے لئے استاد کا کام کرتے تھے، ورنہ نہ تو انھیں کبھی شاعروں کی صحبت نصیب ہوئی اور نہ ہی انھیں شاعری ورثے میں ملی۔

اُن کے والد بھگت رام دیال ایک خوش حال کاروباری آدمی تھے، البتہ اُن میں ایشور کی بھگتی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ شاید والد کے اس سیدھے تعلق کو فرزند نے نیچر کے ذریعے سے محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ وہ احساس جو انجام کار پختگی کو پہنچ کر ان ولولہ انگیز شعروں میں ظاہر ہوا ہے

---

[1] اب وہ گاؤں دریا برد ہو چکا ہے۔ (سحر)

میانِ انجم تاباں ظہور کس کا ہے؟ بتاؤ مہرِ منوّر میں نور کس کا ہے؟

دماغِ فلسفی! تجھ میں شعور کس کا ہے؟ یہ تجھ میں اے دلِ شاعر سرور کس کا ہے؟

یہ کس کے جلوے ہیں؟ سارے خدا کے جلوے ہیں

ہونہار شاعر سات برس کی عمر میں گاؤں کے ورنیکولر اسکول میں داخل ہوا۔ دس سال کی عمر میں کم سن لڑکے نے شاعر بننا شروع کیا، اور اس کے خیالات زمانۂ طفلی کے حسبِ حال نظموں کی شکل میں ظاہر ہونے لگے، اُس وقت اردو کے ساتھ پنجابی محاورے بکثرت ملے ہوتے تھے، جو اب بھی کہیں کہیں اپنی ناگوار جھلک دکھا جاتے ہیں۔

خیر ۱۹۰۵ء میں عیسیٰ خیل میں مڈل پاس کر لینے پر ہمارا شاعر ضلع کے ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ تعلیمی ترقی کے ساتھ ہی شاعری نے بھی ترقی کی، مگر گاؤں کی طرح ضلعے میں بھی نہ تو کوئی شاعر کا قدردان تھا، اور نہ اُس کے کلام کی داد دینے والا۔ نظمیں موزوں ہوتیں، ہم عمر یا ہم جماعت طلبا کو سنائی جاتیں، اور پھر پھاڑ کر پھینک دی جاتیں۔ البتہ سخن سنجی کے لئے ہمت افزائی کی خاطر ضلع بھی گاؤں کی مانند فطری مناظر سے بھرپور تھا۔ اُن سے مستفید ہونے کے لئے شاعر پڑھتا تو کم تھا، مگر گھومتا زیادہ تھا۔ پھر بھی اپنے درجے میں ہمیشہ اوّل ہی رہتا۔ اس لئے استاد بھی اُس کے گھومنے پھرنے اور شعر کہنے میں سدِّراہ نہ ہوتے تھے۔

اس طرح پڑھتے ہوئے ۱۹۰۶ء میں دسویں جماعت (انٹرنس) پاس کرلینے کے بعد محروم نے ۱۹۰۸ء میں ٹریننگ کالج سے جے، اے، وی کا امتحان پاس کیا، اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مشن ہائی اسکول میں مُدرس ہوگئے۔ پھر ۱۹۱۴ء میں وہیں کے کھتری ہائی اسکول میں کام کرنے لگے۔ مگر خاندانی معاملات سے مجبور ہوکر ۱۹۱۶ء میں اپنے گھر عیسیٰ خیل چلے گئے۔

اُنھوں نے ایف اے تو ڈیرہ اسمٰعیل خاں ہی سے پرائیویٹ طور پر ۱۹۱۳ء میں پاس کرلیا تھا۔ پھر اسی طرح ۱۹۲۰ء میں عیسیٰ خیل سے بی، اے بھی پاس کیا۔ اب مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ایس، اے، وی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی تبدیلی کلور کوٹ (میانوالی) میں کرالی، جہاں وہ ورنیکولر مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ان کی تعلیم اور نوکری کا یہی تھوڑا سا حال ہے۔ اتنا پڑھ لکھ لینے پر بھی انھیں کوئی اچھی جگہ نہیں ملی۔ وہ یہ کہ انسان کی تقدیر میں شاعر کا مقدر بھی تو شامل تھا۔ تقدیر نے اُنھیں کسبِ معاش کے لئے کافی قابلیت عطا کی، مگر مقدر نے اُنھیں رتبۂ شاعری کے باوجود کسبِ معاش سے محروم ہی رکھا،

محروم ابھی دسواں درجہ پاس نہ کرنے پائے تھے کہ اُن کی نظمیں "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور جیسے اُردو کے مشہور ماہناموں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ اُس کے بعد تو شاعر کے کلام کی اشاعت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی، اور عموماً

تمام اُردو اخبارات اور رسالوں نے اُن کے کلام کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھا۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک آٹھ ہی برس میں شاعر کی شہرت اتنی پھیل گئی کہ اردو کا ادبی حلقہ ان سے بخوبی واقف ہو گیا، اور اُن کی قدر ہونے لگی، عام لوگوں کا کہنا ہی کیا، دہلی اور لکھنؤ کے بڑے بڑے اُستادوں نے بھی اُن کے کلام کی داد دی، شاعر کا کلام کس پائے کا ہے، اور اردو شاعری کی دنیا میں اس کا کیا مقام ہے، اس کے لئے وہ رائے بھی قابلِ غور ہے جو لندن کے "ایشیاٹک ریویو" کے ایک آرٹیکل میں شائع ہوئی تھی، رائے یہ ہے "شمالی ہند میں اس وقت دو ملک الشعرا ہیں ——— اقبال اور محروم" ——— ڈاکٹر اقبال نے محروم کے بارے میں ایک بار کہا تھا "اس شاعر کا اُردو میں وہی درجہ ہے جو انگریزی میں کیٹس کو حاصل تھا"

مگر محروم کے کلام کی اہم ترین توصیف اکبر الہ آبادی کی ہے۔ اکبر عظیم شاعر ہونے کے علاوہ صاحبِ طرز شاعر بھی تھے۔ کلامِ محروم (دوسرا حصہ) ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا، اُسے دیکھ کر انھوں نے یہ رباعی 'زمانہ' میں شائع کرائی تھی ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

اس کے جواب میں محروم صاحب نے بھی شکریے کے طور پر یہ رباعی اسی ماہنامے میں شائع کرائی تھی ؎

طبعِ موزوں ندائے برتر سے ملی
تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں
جب دادِ سخن جناب اکبر سے ملی

یہ حصّہ محروم کی قومی اور تاریخی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پیشتر کلامِ محروم کا پہلا حصّہ سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپ چکا تھا جسے ادبی، اخلاقی اور فطری نظموں کا مجموعہ[1] کہنا چاہیئے۔ اس پر پنجاب سرکار نے شاعر کو دو سو روپے کا انعام بھی دیا تھا۔ دونوں حصّوں کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں تیسرا حصّہ بھی چھپا، جس میں عشقیہ نظمیں اور غزلیں وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔

اس تیسرے حصّے میں دردبھری نظمیں بھی ہیں جنھیں شاعر نے اپنی رفیقۂ حیات کی وفات پر "طوفانِ غم" کے عنوان سے لکھا تھا، یہ سانحہ سنہ ۱۹۱۵ء میں وقوع پذیر ہوا۔ اس صدمے سے نوجوان شاعر کا دل ٹوٹ کر رہ گیا، وہ رو اٹھا، اس کا رونا شاعر کا نوحہ ہے، جو اسے رُلاتے ہوئے دوسروں کو بھی رُلا دیتا ہے، اس طرح کے بحرِ غم میں ڈوب کر انھیں دلاسا دینے کا خیال ہی نہیں رہتا۔ دیکھئے، شاعر کہتا ہے ؎

نہ کر کے جاؤ مجھے آہ! خانماں برباد
نہ دے کے جاؤ مجھے شغلِ نالہ و فریاد
رکھا ہے میں نے تمھیں اور تم نے مجھ کو شاد
نہ جھیلی جائے گی ہجرِ دوام کی افتاد

---

[1] یہ مجموعۂ کلام اب نہایت دیدہ زیب اور جمیل کتاب "گنجِ معانی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ (بحر)

کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے
ابھی سے ہو گئے تیار کیوں اُدھر کے لئے؟

شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی
گزرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی

تمہارے مرنے کے اے جاں! یہ دن نہیں ہرگز
جہاں سے اُٹھنے کے یہ سال و سن نہیں ہرگز

شاعر کی سال بھر کی ننھی بچی "ودیا" بھی وہیں موجود ہے۔ اس کے متعلق وہ پھر کہتا ہے ؎

کیوں برخلافِ عادت و کراٹھی ہے ودیا؟
جاگو اسے اٹھا لو سو کراٹھی ہے ودیا
صبر و قرار شاید کھو کر اُٹھی ہے ودیا
بے تاب اس طرح کیوں ہو کر اُٹھی ہے ودیا

اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے
خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے

آہ کتنی یاس ہے، شاعر اور معصوم بچی دونوں کی بے بسی کا نظارہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، آگے شاعر بچی کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس تسلی کی کمی کو بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ہیں جان و دل مرے تو تجھ پر نثار ودیا
کچھ اور چیز لیکن ہے ماں کا پیار ودیا

آخر میں شاعر اپنی ذاتی حالت پر نظر ڈالتا ہے ؎

ابرِ آلام دل پہ طاری ہے وہی
آہیں وہی اور اشکباری ہے وہی

مردہ ہوں کہ لطفِ زیست سے ہوں محروم　　زندہ ہوں کہ دل کی بیقراری ہے وہی

کتنا درد ہے! کتنی تڑپ ہے، مرنا تو ٹھیک، مگر جینا تو مرنے سے بھی بدتر ہو رہا ہے۔

مذکورہ بالا سانحہ بھی شاعر کی اس زندگی کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس میں غم ہی غالب دکھائی دیتا ہے۔ مناسب روزگار کے حصول میں ناکامی، عالمِ شباب میں رفیقۂ حیات کی مفارقت —— یہ دکھ معمولی نہیں ہے، مگر شاعر کو جس بات کا ہمیشہ دکھ رہا، وہ اپنی طبع کے موافق ادبی صحبت کا نہ ملنا تھا جس کے متعلق وہ اب بھی کہتا ہے ؎

کیا ہے کلورکوٹ میں محرومِ لطفِ زیست؟
صحرا میں دن بہار کے کیا آئے کیا گئے!

ایسی ہی مایوسیاں اس کی حالت کو زیادہ سے زیادہ غمناک بناتی چلی گئیں۔ وہ فطرت کی گود میں پلا، فطرت ہی نے اسے شاعر بنایا، فطرت ہی کی مدد سے اُس نے اپنی کوتاہیوں کو دور کیا۔ فطرت کے خوبصورت اور وسیع دائرے میں اُس کی زیادہ تر نظمیں لکھی گئیں۔ اسے لکھنے میں لطف بھی آیا، مگر وہ لطف بھی قدرتاً فطرت کا الم خیز لطف تھا، اُس نے جو کچھ کہا ایک ایسی زبان میں کہا، جو دلوں میں میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتی ہوئی ایک لذت آمیز ٹیس پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھئے ؎

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں؟ ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں؟
گلشنِ دہر میں فراغ کہاں؟ چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں؟

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

بیقراری ہے کیا خبر کیوں ہے؟ آہ و زاری ہے کیا خبر کیوں ہے؟
دلفگاری ہے کیا خبر کیوں ہے؟ اشکباری ہے کیا خبر کیوں ہے؟

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

اس دوسرے بند میں شاعر کی محویت کا بھی کیا کہنا؟ شاعر بے قرار ہے، مگر استغراق اتنا ہے کہ اسے وجہ معلوم نہیں۔ وہ "شامِ غم" کہتا ضرور ہے، مگر اس طرح گویا اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں، ؎

وہی شام دھندلی دھندلی، وہی رات کالی کالی
وہی خامشی ہوا میں، وہی بدلیوں کی جالی
وہی شمع پھیکی پھیکی، مرے ساتھ رونے والی
وہی میں، وہی مرا دل، وہی مشورے خیالی

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

مرے گھر میں کیوں خموشی، مرے دل میں کیوں تباہی؟

یہ مکاں ہے یا کہ صحرا، میں مکیں ہوں یا کہ راہی؟

در و بام پر ہے یکسر شبِ گور کی سیاہی

میں ہوں زندہ یا کہ مردہ؟ مجھے کیا ہوا الٰہی؟

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

شاعر نے انجام کار وہی باتیں پھر کہی ہیں، مگر دوسرے ڈھنگ سے، اک سبب کا صاف پتہ دیتے ہوئے۔ لیکن کلام زیادہ پُرلطف اور مترنم ہے۔ شاعر رات کا حال بیان کرتا ہے۔ اس لئے اس کے لفظ لفظ سے رات اور رات میں ہونے والی باتوں کا ہی خاکہ کھنچ گیا ہے۔ ؎

اومہ تاباں! ترا کب سے تماشائی ہوں میں — تیرے جلووں پر جنوں بڑھتا ہے سودائی ہوں میں

سربسر وارفتہ شانِ دل آرائی ہوں میں — حُسنِ دلکش کی قسم، تیرا تمنائی ہوں میں

شاہدِ اوجِ فلک! ہاں مسکرائے جا یونہی

اور مجھ کو پیکرِ حیرت بنائے جا یونہی

تھا کبھی تو ایک جادو کا کھلونا ہائے ہائے — وہ نظر آنا ترا، حاصل نہ ہونا ہائے ہائے

رات کو پہروں مچلنا اور نہ سونا ہائے ہائے — نیند کی وادی میں آخر تجھ کو کھونا ہائے ہائے

وہ ہجومِ شوقِ پنہانی دلِ بیتاب میں

تیرے پیچھے اڑکے جانا آسماں پر خواب میں

پہلے بند کا تیسرا شعر کس غضب کا ہے، شاعر تبسم پر بھی خوش ہونا نہیں جانتا وہ زیادہ سے زیادہ فقط حیران ہو کر رہ جاتا ہے۔

دوسرے بند میں شاعر اپنے بچپن کو یاد کر کے اس کی چلتی جاگتی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ چھٹا شعر تخیلِ کلام کی رفعت، خیالات کی لطافت اور واقعہ نگاری کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ بیان کچھ اس انداز کا ہے کہ وہ یادِ رفتہ بن کر شاعر کو تکلیف دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی ۔۔۔ ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی ۔۔۔ عطر اڑاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

صحنِ چمن سے چلی چھیڑتی اشجار کو ۔۔۔ برگ و گل و خار کو
وصل کے ایام کا بلبلِ بیمار کو ۔۔۔ مژدہ سناتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی ۔۔۔ صبر اڑاتی ہوئی
پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی ۔۔۔ درد اٹھاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی!

کتنی جاندار زبان اور کتنا جاندار کلام ہے۔ اگرچہ موسم بہار کا ہے، مگر شاعر کی تقدیر میں تو غم ہی ہے۔ اسے اگلی بہاروں کے دن یاد آجاتے ہیں اور مغموم ہو جاتا ہے ۔

شگفتہ لالہ وگل اب بھی ہوتے ہیں بہاروں میں وہی ہے لمبی لمبی دوب اب بھی سبزہ زاروں میں
وہی اب ہے جو پہلے تھا ترنم آبشاروں میں دکھاتی ہے کرشمے اب بھی قدرت کوہساروں میں

نظارے ہیں وطن کے دلنشیں جیسے کہ پہلے تھے
مگر افسوس ہم ویسے نہیں جیسے کہ پہلے تھے

محروم کی متعدد نظموں سے جو اقتباس اوپر دیئے گئے ہیں اُن سے صرف یہ دکھانا مقصود نہیں ہے کہ اُن میں غم سے کس قدر محبت پائی جاتی ہے، بلکہ ان سے یہ دکھانا بھی مطلوب ہے کہ ان کی نظموں کا خاص رنگ کیا ہے۔ وہ اردو کے کامیاب شاعر ہیں اور انھیں انسانی خیالات اور دل کے پوشیدہ جذبات کے اظہار میں کیسی اچھی مہارت ہے، اردو زبان پر انہیں اس قدر قدرت حاصل ہے کہ اظہارِ بیان کے مطابق با موقع اور برمحل الفاظ فوراً تلاش کر کے رکھ دیتے ہیں جس سے کلام میں درد روانی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ اپنی تخئیلی مساعی میں وہ عموماً نہ بہت بلندی تک جاتے ہیں، اور نہ بہت گہرائی تک، بلکہ وہ اس حالت میں رہتے ہوئے چلتے ہیں جسے ہم میانہ روی کہتے ہیں۔ وہ دنیا کو دیکھتے ہیں، اس کی استعداد کو پرکھتے ہیں، اور اسی کے موافق اسے کچھ سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اکثر کوئی اس قسم کا مضمون بھی چن لیتے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اُسے شاعر کی زبان میں اور اس ڈھنگ سے کہتے ہیں جس سے مضمون کے اظہار میں شاعر کی خاص شخصیت کی چھاپ برابر بنی رہے۔

چنانچہ نتیجتہً اُن کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہ آگئی ہے کہ وہ سادہ ہے، اور تصنّع سے مبرّا ہے۔ اس خوبی نے اُن کے کلام کو خاص و عام دونوں کے لئے مقبول بنا دیا ہے۔

اب اُن کے کلام کے چند اور نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ اپنی ایک پرجوش نظم میں جسے رامائن کی چھوٹی تصویر کہنا چاہیئے، مریا دا پرشوتم رام چندر جی سے خطاب کرتے ہیں ؂

کاش ہم بھی رام تیرا روئے انور دیکھتے	چترِ شاہی سایہ افگن تیرے سر پر دیکھتے
تیرے اندازِ جمالی و جلالی کی قسم	دیکھتے کچھ پیار سے اور کچھ جھجک کر دیکھتے
یا تو ہو جاتا ترا دورانِ کلجگ میں ظہور	یا ہمیں ترتیا میں واپس تجھ کو جا کر دیکھتے

دوسرے شعر میں جمالی اور جلالی کی رعایت سے پیار اور جھجک کے الفاظ کا استعمال فن کی انتہا ہے، اس شعر کے پہلے مصرع کے الفاظ رام کے لئے ہی موزوں ہیں۔ تینوں شعروں سے رام کے دیدار کی زبردست خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

اب ترتیا سے کلجگ میں آجائیے۔ شاعر نے ڈاکٹر اقبال کے یورپ سے لوٹنے پر اُن کو مخاطب کر کے کچھ شعر کہے تھے، ان میں سے تین یہ ہیں ؂

محفل میں رنگِ الفت اے شیخ و برہمن	لایا فرنگ سے ہے جو مے وہی پلائے
پھر ہو رہی ہے اَن بَن کچھ شیخ و برہمن میں	اُن کو گلے ملا دے روٹھے ہوئے منائے

ناقوس پھونک ایسا، ایسی اذاں سنادے　　کلمہ پڑھیں ترا اب ہو کفر دور دل سے

ان اشعار کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے جو کچھ اقبال سے کہا ہے وہ اقبال ہی کے رنگ میں ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اس کا خطاب اب کے اقبال سے نہیں ہے، بلکہ اس تب کے اقبال سے ہے جب وہ شنکھ (ناقوس) بجاتے اور اذاں دیتے ہوئے اور دونوں کی آوازوں کو اپنے شاعرانہ سحر سے لبریز کرتے ہوئے 'برہمن' اور 'شیخ' دونوں کو اپنا 'کلمہ' پڑھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ آخری مصرع بڑا پُراثر ہے۔ دونوں کو ایک سمجھنے سے ہی ان بن دور ہو سکتی ہے۔

مخدوم صاحب نے بچوں کی نظمیں بھی بہت لکھی ہیں۔ ان میں شاعر کی طبعی سادگی اور بھی سادہ ہو گئی ہے۔ بچوں کی زبان ہی میں بچوں کو نصیحت دی گئی ہے۔ نظمیں اس قابل ہیں کہ انھیں بچوں کے کورس کی کتابوں میں خاص طور پر اور فراخ دلی سے جگہ دی جائے۔ یہاں اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مخدوم صاحب کا کلام پنجاب، بمبئی، صوبہ جات متحدہ کے اُردو کورسوں میں داخل ہے۔ اب بچوں کی نظموں کا نمونہ بھی دیکھئے ؎

گر چاہتے ہو عزت، محنت سے وہ ملے گی　　درکار اگر ہے شہرت، محنت سے وہ ملے گی
ہے جس کا نام دولت، محنت کرو ملے گی　　کہتے ہیں جس کو قسمت، محنت سے وہ ملے گی

محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

اس میں خشک نصیحت ہی نہیں ہے، چوتھے مصرعے میں شاعر نے "قسمت" کو دکھ کر اپنا شاعرانہ کمال بھی دکھایا ہے، اور دیکھئے ؎

یہ جوگی ہیں رکھتے ہیں جنگل میں ڈیرا | کہ شہروں میں رکھتے ہیں کمتر بسیرا
لگے یادِ حق میں ہوا جب سویرا | بہت اُن کو آتا نہیں تیرا میرا

کرو رحم کا اُن سے برتاؤ بچو!
پرندوں کو ایذا نہ پہنچاؤ بچو!

شاعر نے کتنی روحانی بات کہہ کر بچوں سے چڑیوں کے نہ ستانے کی اپیل کی ہے۔

اس سلسلے میں ان فارسی نظموں کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے جنھیں شاعر نے "گلستاں" سے ترجمہ کیا ہے۔ گلستان شیخ سعدی کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، جو نظم و نثر میں پند و نصائح سے بھری ہے۔ شاعر نے ان نظموں کا ترجمہ کس میانی سے کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

اک دوسرے کے عضو ہیں انساں ہیں جس قدر | اک خانداں سبھی کا ہے اک اصل، اک گھر
اک عضو کھا کے چوٹ اگر بے قرار ہو | جو دوسرے ہیں پھر انھیں کیسے قرار ہو

اوروں کے درد و غم سے تو بے غم اگر رہے
ممکن نہیں کہ کوئی تجھے آدمی کہے

کتنا اچھا، کتنا آسان ترجمہ ہے، ملک الشعرا سعدی نے خواہ ان اشعار

گے ذریعے سے اسلامی مساوات کی تبلیغ کی ہو، مگر عبارت کی موجودہ صورتِ حال کے لحاظ سے تو آج کل کی اچھوت اُدھار کی تحریک پر ان کا پورا اطلاق ہوتا ہے۔

اسی طرح شاعر نے بہت سی انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے، ملک الشعراء شیکسپیئر کے ایک جزوِ کلام کا ترجمہ یوں ہے ؎

جو بزدل ہیں وہ پہلے موت سے سو بار مرتے ہیں
دلاور ایک بار اس دہرِ فانی سے گزرتے ہیں

جہاں کی جن عجیب باتوں کا مجھ سے ذکر کرتے ہیں
یہ سب سے حیرت افزا ہے کہ اکثر لوگ ڈرتے ہیں

نظر جب صاف آتا ہے کہ اک دن خاتمہ ہوگا
وہ دن جب آئے گا، آئے گا، حاصل ڈر سے کیا ہوگا

پرسی بشی شیلی کی ایک نظم کے ٹکڑے کا ترجمہ دیکھئے ؎

نہیں دنیا میں کوئی شے تنہا
کوئی قانون یہ خدائی ہے

ایک سے دوسرا یہاں ہے ملا
پھر مجھے تم سے کیوں جدائی ہے

اب آخر میں محروم صاحب کی غزلوں کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں

غزل عاشقانہ شاعری کا نام ہے۔ غزل سے فارسی اُردو کے پرانے اور بڑے شاعروں کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ اُردو کے نئے شاعر غزل کہتے تو ضرور ہیں مگر کم، اور اکثر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر ان میں عشق کا ذکر بھی ہو تو لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ۔ محروم اُردو کے جدید شاعر ہیں۔ مذکورہ بالا نمونوں سے

یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو گی، مگر غزلوں سے بھی ان کا اتنا اور اسی طرح کا تعلق ہے، جسے جدید عہد سخن کا چلن کہنا چاہیے۔ انھیں عاشقانہ کلام سے خواہ مخواہ کی چڑ نہیں ہے۔ اپنے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں۔

"اگر عاشقانہ اشعار نوجوانوں کی طبیعت میں افسردگی یا آوارگی کے بجائے سوز و گداز یا جوہرِ حسن شناسی پیدا کر سکیں تو ہمیں اس قسم کی شاعری کو فروغ دینے میں بخل سے کام نہ لینا چاہیے۔ بعض مصلحانِ قوم کا یہ فتویٰ کہ عاشقانہ شاعری سرے سے مخربِ اخلاق ہے، میرے نزدیک ترمیم کا محتاج ہے۔ کیونکہ "در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی" ہر شخص قدرتاً حسن و عشق کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اور اس قدرتی رو کو روکنے کے عوض اُسے بے ضرر راستے پر ڈال دینا ہی انسب ہے۔"

یہی نظریہ اُن کی غزلوں میں جاری و ساری رہا ہے، اُن کی غزلیں اُن کے اپنے دل کے سوز و گداز سے روشن ہیں ؎

شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ نازِ خواب ہے کوئی
کہ ایمائے خموشی ہے کواکب کے اشاروں میں

اُٹھانے کے قابل ہیں سب ناز تیرے
مگر ہم کہاں ناز اُٹھانے کے قابل

کوہ و صحرا و ساحلِ دریا
بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں

ہے صبح اور آج پریشاں ابھی سے ہیں
یعنی شبِ فراق کے ساماں ابھی سے ہیں

تری نظروں سے گر جانا ترے دل سے اُتر جانا
یہ وہ اُفتاد ہے جس سے بہت اچھا ہے مر جانا

کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی؟ کس سے کہوں جو تم نہ سنو ماجرائے دل؟

دوسرے شعر میں اندازِ بیان کی سادگی اور الفاظ کی تکرار نے بات پیدا کر دی ہے، ساتھ ہی شعر سے ایک ایسی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے جس میں تصنّع نام کو بھی نہیں۔

الٰہی کیسے ہیں میری اُمید کے پودے نہ پھولتے نظر آتے ہیں یہ نہ پھلتے ہیں

چمکتے پیری میں ہوں گے یہ داغہائے شباب کہ شام ہوتی ہے جس دم چراغ جلتے ہیں

دوسرے شعر میں کتنی بلیغ بات کہی ہے۔ داغہائے شباب کی پیری میں تابندگی کی شام کے چراغوں سے تشبیہہ کتنی نادر تشبیہہ ہے۔

جان و دل پر جتنے صدمے ہیں اسی کے دم سے ہیں زندگی ہے فی الحقیقت دشمنِ جانی مری

باغِ دنیا میں یونہی رو ہنس کے کاٹوں چار دن زندگی ہے شبنم و گل کی طرح فانی مری

لختِ دل کھانے کو ہے خونِ جگر پینے کو ہے میزبانِ دہر نے کی خوب مہمانی مری

نغمہ زن ہو جس طرح صحرا میں کوئی عندلیب یوں ہے اے محروم سرحد میں غزلخوانی مری

پہلے شعر میں زندگی ہی کا جانی دشمن ہونا کس آسانی، سادگی اور خوبی سے ثابت کیا ہے۔

دوسرے شعر میں شبنم اور گل کی عارضی زندگی سے اپنی چند روزہ زندگی کو مشابہ بتاتے ہوئے انہی کی طرح زندگی کو رو ہنس کے کاٹ دینے کا

خیال کس قدر لطیف ہے۔

تیسرے شعر کا پہلا مصرع ایک عام بات ہے لیکن شاعر نے کس خوبصورتی سے اسے استعمال کیا ہے۔

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم، آزارکشِ بیداد رہے
سبزے کی طرح پامال ہوئے نکہت کی طرح برباد رہے

یہی جگر برشتگی اور دل گداختگی شاعر کا سرمایہ حیات ہے۔ اگر اسے ذات میں تحویل کیجئے تو محروم، اور اگر الفاظ میں استعمال کیجئے تو محروم کا کلام۔

"دیشال بھارت" الہ آباد
نومبر ۱۹۳۳ء

(ہندی سے ترجمہ)

گنجِ معانی

دیا نرائن نگم

منشی تلوک چند محروم اردو کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔ آپ ضلع میانوالی کے رہنے والے ہیں۔ جہاں اردو زبان کا بہت کم چرچا ہے۔ مگر بقول سر عبد القادر اس جنگل نے وہ خودرو پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی۔ چنانچہ اب تک کلامِ محروم کے نام سے آپ کی دل کش نظموں کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ اب آپ کی ۱۹۱ ادبی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ "گنجِ معانی" کے نام سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور آنریبل شیخ سر عبد القادر بالقابہ جج ہائی کورٹ پنجاب نے اس کا دیباچہ تحریر فرمایا ہے، جس میں محروم کی شاعری پر لطیف بحث کی گئی ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ میانوالی

میں پیدا ہو کر ایسی صاف اور سلیس زبان لکھنا جیسی موسجاب متمدہ کی ہوتی ہے، عجائبات میں ہے، اور اس بارے میں محروم صاحب کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

اس دلچسپ مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ محروم کی طبع رسا میں کس قدر تنوع، کس قدر بوقلمونی، کس قدر رعنائی، اور کس قدر رنگینی ہے۔ اس مجموعے کو گیارہ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور اس کا ہر ایک حصّہ بجائے خود مکمل اور مستقل رسالہ ہے۔ اس کی اکثر نظمیں درسی کتب میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔

مختلف نظموں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ محروم صاحب کو زبان و تخیّل پر قدرت حاصل ہے۔ بقول میتھو آرنلڈ "شعر تنقید حیات کا دوسرا نام ہے"۔ اس اعتبار سے ہر چیز جس کا انسان کی زندگی سے تعلق ہے شعر کا موضوع بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ محروم کی ۱۹۱ نظموں سے بھی اس قول کی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ فلسفہ، اخلاق، جذبات کی تحلیل و تشریح، مذہب، روحانیت، غذا، غرض ہر چیز پر محروم صاحب نے قلم اٹھایا ہے، اور بحدِ کمال پہنچا دیا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں، اور پھر اپنے کمالِ فن کی بدولت مختصر الفاظ میں اس حسن کو منکشف کر دیتے ہیں، جو موضوع میں اس طرح پوشیدہ تھا جیسے سنگ مرمر میں شرار۔

اصل یہ ہے کہ کلام محروم کی ظاہری خوبیوں کو تو الفاظ میں دکھایا جا سکتا ہے لیکن اس کی وجدانی اور ذوقی کیفیتیں اور لطیف و نازک ادائیں الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ پھول کی بُو، ساز کا نغمہ، شراب کا نشہ لفظوں کی قید میں نہیں آ سکتا ہے، اور اس کے لئے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک "گنجِ معانی" کی سیر نہ کی جائے اُس وقت تک احباب لطفِ سخن سے محروم رہیں گے۔

"زمانہ" کو شروع سے کلام محروم کی اشاعت کا موقع ملتا رہا ہے۔ اس لئے ہم کو یہاں اس سے مفصل اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن آپ کے کلام معجز نظام کی بعض خصوصیات کا مختصر تذکرہ بے موقع نہ ہوگا۔

اکثر شعراء کے شاعرانہ محسوسات کا میلان ایک خاص مرکز پر ہوتا ہے۔ اُن کے قلب سے ایک خاص صدا نکلتی ہے، اُن کا سازِ ہستی تمام ہم آہنگیوں کے ساتھ ایک خاص نغمہ بلند کرتا ہے۔ اُن کے قدم ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف اُٹھتے ہیں۔ اُن کی روح کا ایک پیغام ہوتا ہے، چنانچہ محروم کی روح کا پیغام درد و غم ہے۔ اُن کی زندگی ایک داستانِ غم ہے۔ آپ کی رفیقۂ حیات شادی سے چند ہی سال بعد ایک ننھی سی بچی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ بچی کی بے بسی، اپنی خانہ ویرانی اور اسی طرح کے صدماتِ پیہم نے محروم کو مجسم درد یا سوز و گداز کا پتلا بنا دیا ہے، جوانی کی اُمنگیں مٹ گئیں، ولولے جاتے رہے، دل کی بستی غموں نے اُجاڑ دی۔ "دنیا ہیچ است و کارِ دنیا

"ہمہ ہیچ" کی حقیقت نظر آنے لگی۔ ہجوم آلام سے پریشان ہو کر اُن کی آنکھوں میں آنسو
بھر آتے ہیں، اور وہ یہ آہِ سرد کہنے لگتے ہیں۔

کبھی ابرِ کرم کی نہ بوند گری، ہوئی آہ نہ شاخِ اُمید ہری
ترے دل کی کلی نہ کِھلی نہ کبھی، ترے باغ میں بادِ صبا نہ چلی
نظر آئی نہ صبحِ وصال کبھی، شبِ غم نہ ٹلی، نہ ٹلی، نہ ٹلی
جسے ڈھونڈھ رہا تھا حرم میں کبھی، کبھی دیر میں جس کی تلاش رہی
رگِ جاں سے وہ تیرے قریب رہا، تری آنکھیں ہی میں نظر ہی نہیں
نہ بہارِ نشاطِ دو روزہ پہ مر، کہ ہے باغِ جہاں میں خزاں کا گذر
یہ طلسم ہے سارا فریبِ نظر، نہ ہے غنچۂ تر نہ حجرۂ شجر
جو رکھے تو مآلِ جہاں کی خبر، تو اُٹھائے کبھی نہ ملالِ ضرر
ہو طالبِ عیشِ فنا تو اگر، تو حریمِ بقا سے امید نہ کر
یہ وہ دام ہے جس سے مفر ہی نہیں، یہ وہ شام ہے جس کی سحر ہی نہیں

بہار ہو یا خزاں، گرمی ہو یا جاڑا، قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر محروم کے
دل کا کوئی نہ کوئی غم تازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً فصلِ بہار کی نظم میں بھی حسنِ فطرت
کی عقیدت مندانہ پرستش کے ساتھ محروم صاحب خندۂ صبح اور جلوۂ شام
سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہے جاتے ہیں۔

آمدِ گل کا ہم کو کیا احساس　　دل ہے پہلو میں کب سے کشتۂ یاس

یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس ہے فقط اپنی شاعری کا پاس!

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک

برگِ گل اور نوکِ خار ہے ایک

موسم سرما رخصت ہو چکا ہے، اور بہار کی آمد آمد ہے۔ سرسوں پھول رہی ہے۔ بلبلیں ترانہ ہائے مسرت گا رہے ہیں۔ باغ دراغ، کوہ و دشت سب دل فریب مناظر پیش کر رہے ہیں۔ مگر محروم انھیں دیکھتے دیکھتے پکار اُٹھتے ہیں ؎

گمراہ جس چمن کا میں ہوں عندلیبِ نالاں ہوئی مدتیں کہ اس میں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم رہی تا سحر وہ گریاں جو صبا کہیں سے آئی تو لیے غبار آئی

شام کا وقت ہے، دریائے راوی میں ستاروں کے عکس نے سطحِ آب پر ایک اور جگمگاتا آسمان بنا دیا ہے۔ مگر اس نظارۂ فریب حسین میں بھی محروم کا دل ملول ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عید بھی ہو مجھے محرم ہے میرا سینہ ہے خنجرِ غم ہے
خوں فشاں کب سے چشمِ پُرنم ہے دشتِ غربت ہے شامِ ماتم ہے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

محروم کے لیے نگار خانۂ فطرت کا ہر نقش حسین ہے۔ جن چیزوں پر معمولی

آدمی ایک سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ان میں شاعر کو فطرت کے اسرار و محاسن نظر آتے ہیں، اور اسے قدرت کے سکوت و خامشی میں بھی وہی نغمے سنائی دیتے ہیں، جن سے روح کی بالیدگی ہوتی ہے، اس کے لئے ستارے رقص کرتے ہیں۔ آسمان چراغِ مہر و وفا روشن کرتا ہے۔ بجلی کی تڑپ، بادل کی گرج، ہوا کے جھونکے سب اس کے محرمِ راز ہیں، انھیں مناظر و مظاہر کو عام آدمی روزانہ دیکھتا ہے، اور بھول جاتا ہے، لیکن شاعر کے لئے یہی معمولی داستانِ حسن اور افسانۂ عشق کا کام دیتے ہیں۔ معمولی آدمی کے لئے دریائے گنگا ایک بڑا دریا ہے، جو ایک وسیع خطۂ ملک کو سیراب کرتا ہے۔ مگر محروم اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

جوشِ زنِ رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر — بہہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر
آئی ہے راہرو عالمِ بالا ہو کر — رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریا ہو کر

عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منور گنگا
مظہرِ نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا

نورِ سیّال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو — حیرت افزودلِ و دیدۂ حیراں ہے تو
کس دلآویزی و تیزی سے خراماں ہے تو — مجھ کو حیرت ہی نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو

حُسنِ بیتاب! نمائش سے پشیماں کیوں ہے؟
پردۂ رُخ ترا جلوہ ہے گریزاں کیوں ہے؟

محروم نے بہار کی تصویر جس دلفریبی و رنگینی کے ساتھ کھینچی ہے اُس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

مسندِ شاہدِ بہار — تختۂ سبزہ زار ہے
شبنمِ ترِ کشت زار — تختِ گہر نگار ہے
مظہرِ جلوۂ طرب — ساحتِ روزگار ہے
رُوح نواز کس قدر — نغمۂ آبشار ہے
منظرِ صافِ سطحِ آب — آئینۂ بہار ہے
دشت میں الغرض عیاں — قدرتِ کردگار ہے

شاخ بہ شاخ سُو بہ سُو — نغمہ سرا طیور ہیں
گرم ہے محفلِ نشاط — بادہ کشِ سرور ہیں
جُھومتے ہیں شجر تمام — مست نشے میں چور ہیں
رقصِ شعاعِ مہر کے — جلوے قریب و دور ہیں
ذرے تمام خاک کے — رشکِ کوہِ طور ہیں
قدرتِ صانعِ ازل — سب یہ ترے ظہور ہیں

[illegible]
اُن کے اقتباسات نذر انداز کر رہے ہیں۔

زمانہ کانپور ۱۹۳[illegible]

محروم کی شاعری کا وطنی اور قومی پہلو

گوپی چند نارنگ

تلوک چند محروم کا نام زبان پر آتے ہی ذہن ایک قرن پہلے کے اُن شاعروں کی طرف جاتا ہے جنھوں نے آزاد اور حالی سے نظم کی شمع ہاتھوں ہاتھ لے کر اُردو شاعری کو اس کی روشنی سے معمور کر دیا۔ ان شاعروں میں اسمٰعیل میرٹھی، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، چکبست، اقبال، کیفی اور تلوک چند محروم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کی کوششوں نے نظم کو ایسی جلا دی کہ وہ غزل سے آنکھیں ملانے لگی۔ جو لوگ شاعری کو تہذیبی عوامل سے آزادِ محض قرار دیتے ہیں، انھیں محروم کے ہاں شاید کچھ نہ ملے۔ کیونکہ محروم نے ہمیشہ شاعری کے سماجی اور اجتماعی منصب کو تسلیم کیا ہے اور یہی جذبہ

ان کی نظم گوئی کا محرک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری کی معراج حسنِ محض ہے، لیکن جب دل ناسور بنا ہوا ہو اور زمین انگارا سا دہکتی ہو تو چاند تاروں کی خنک روشنی کی باتیں راس ہی نہیں آتیں۔ ایسی حالتوں میں شاعری اپنا مقصد آپ نہیں رہتی بلکہ بہتر مستقبل کی تمنا کرنا بھی شاعر کا منصب بن جاتا ہے۔ محروم نے شاعری کے اسی نظریئے کو تسلیم کیا ہے اور ساری عمر اسی روش پر گامزن رہے ہیں۔

بظاہر ان کی شاعری ہمہ رنگ ہے۔ انھوں نے پہاڑوں دریاؤں کے گیت گائے ہیں۔ اُبھرتی ہوئی کرن کا استقبال اور ڈوبتے ہوئے ستاروں کا ماتم بھی کیا ہے عشق کی واردانوں اور فراق کی راتوں کے نغمے بھی سنائے ہیں۔— گائتری منتر، ویدوں کے اشلوک اور بھرتری ہری کے اقوال بھی دہرائے ہیں۔ رباعیاں اور قطعے بھی لکھے ہیں، اور علم و دانش کے رموز و نکات بھی بیان کئے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ان کا رنگِ سخن نہیں۔ ان کی شاعری کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کی تہ میں گہرا لیکن تھما ہوا کرب ہے۔ ایک بے نام سی بے چینی ہے، اور بے پایاں شورش ہے۔ یہ شورش عبارت ہے انسانی قدروں کی پامالی سے۔ یہی محروم کا رنگِ سخن ہے۔ انسان کو اخلاقی طور پر استوار، ملک کو آزاد اور قوم کو خوشحال دیکھنے کی تمنا اُن کی سب سے بڑی تمنا ہے اور یہی اُن کی شاعری کی جان ہے۔

اُن کی شاعری کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کا آہنگ

انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ یہ ذاتی مسرتوں یا غموں کا ترانہ نہیں بلکہ اُس کا رُخ پورے ملک اور قوم کی طرف ہے۔ اگر شاعر کے فرائض میں ملک اور قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا بھی شامل ہے تو محروم کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اُن کے رنگِ سخن سے سیر حاصل بحث تو ممکن نہیں، صرف اس کے قومی اور سیاسی پہلو کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

تلوک چند محروم ۱۸۸۷ء میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا ملکہ فطرت سے ودیعت ہوا تھا۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ سامراجیوں کی لُوٹ کھسوٹ اور وطن کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر ایک نظم "بھارت ماتا کیوں روتی ہے" کہی۔ اس نظم سے ان کے ابتدائی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

کب سے پامالِ جفا ہوتی چلی آتی ہے
ہدفِ تیرِ بلا ہوتی چلی آتی ہے
کشتۂ تیغِ جفا ہوتی چلی آتی ہے
یوں ہی مظلوم سدا ہوتی چلی آتی ہے

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

جس کی دولت سے ہوا ایک جہاں مالا مال
جس کے دریائے کرم سے کبھی دنیا تھی نہال
آج کل گردشِ افلاک سے ہو کر پامال!
سامنے غیر کے پھیلاتی ہے دامانِ سوال

تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں قومیت کا شعور واضح شکل اختیار کر رہا تھا۔

اور ہندوستانیوں میں تنظیم پیدا ہو چلی تھی۔ اعلیٰ اور اونچے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ ملک کی اقتصادی اور معاشی بدحالی کا راز سمجھنے لگے تھے۔ ملک کو صنعتی تباہی سے بچانے کے لئے کانگریس کا اوّلین قدم سودیشی کی تحریک تھا۔ محروم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

وطن کی اُلفت میں ہو زباں پر سودیش وستو، سودیش وستو
سنا دو ہندوستاں میں گھر گھر سودیش وستو، سودیش وستو
یہیں کی روئی، یہیں کی ململ، یہیں کا ریشم، یہیں کی مخمل
نہ لنکا شائر نہ مانچسٹر، سودیش وستو، سودیش وستو

لگ بھگ اسی زمانے میں محروم نے بہادر شاہ ظفر کے اس مصرعے "اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں" کو تضمین کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:-

پروبال اپنے اسیرو سنبھالو	اٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ پیروں سے رشتے نکالو	بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنالو

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ صیاد ظالم ہے نامہرباں ہے	محبت جو چاہو تو اس میں کہاں ہے
دل آزادیوں میں یہ اک کہکشاں ہے	اذیت نئی نت نیا امتحاں ہے

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ اور ان کی ایسی دوسری نظمیں ان کی صحیح اٹھان کا پتہ دیتی ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کا کلام مخزن اور زمانہ میں شائع ہونے لگا تھا۔ اُردو کے ادبی اُفق پر اس زمانے میں جو آوازیں سب سے بلند تھیں وہ اکبر اور اقبال کی تھیں۔ محروم نے ان دونوں سے اثر لیا۔ لیکن اُن کے اور محروم کے نظریوں میں ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ اکبر مشرقیت کے گہرے پرستار تھے، اور ماضی پرستی کی وجہ سے تاریخ کے دھارے کا رُخ پہچاننے سے قاصر تھے۔ وہ ہر جدید تحریک کی، خواہ وہ قوم اور ملک کی ترقی کے لئے ہی کیوں نہ ہو، سخت مخالفت کرتے تھے۔ ہواخواہِ گورنمنٹ اگر وہ نہ بھی ہوتے تو بھی نئی تبدیلیوں کی طرف ان کا رویہ بدلنے والا نہ تھا۔ انگریز کی واضح سیاسی چالوں کو دیکھتے ہوئے بھی وہ مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کو لغو سمجھتے تھے۔ ع

ہرگز نہ مستقل سمجھ اس انقلاب کو
رکھ راہِ راست بھونکنے دے ان کلاب کو

اقبال، تلوک چند محروم سے صرف تیرہ سال بڑے تھے، اور ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ جب محروم نے اپنی آواز کو پانا شروع کیا۔ اقبال یورپ میں تھے، اور اپنی "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" والی روش ترک کر چکے تھے۔ درگا سہائے سرور جہان آبادی، اقبال سے دو سال بڑے تھے۔ اس لحاظ سے قومی اور وطنی شاعری میں وہ اقبال کے پیشرو تھے، لیکن ابھی اُن کی "خاکِ وطن" "عروسِ وطن" اور

"مادرِ ہند" جیسی نظمیں فضا میں گونج رہی تھیں کہ انھیں جوانی کے بدلے موت ہی آئی۔ (۱۹۱۰ء)۔ اسمٰعیل اس زمانے میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ چکبست البتہ ابھی جوان تھے، اور قومی شاعری کے اُفق پر اُن کی آواز ایک روشن ستارے کی طرح نئی بشارت کا پیغام دیتی ہوئی اُبھر رہی تھی۔ غرض کہ اس زمانے میں جب محروم کی شاعری اپنی سمت کا تعین کرنے لگی، اس کے سامنے سرور اور اقبال کی چند نظموں یا چکبست کی اُبھرتی ہوئی آواز کے علاوہ اور کوئی نشانِ راہ نہ تھا، محروم نے انھیں چراغوں سے چراغ جلایا، اور اپنی لَے کو خوب سے خوب تر بنانا شروع کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری میں ملکی اور قومی عنصر پر ایسے نازک وقت میں توجہ دی جب اکثر اُردو شاعر اپنے قومی منصب سے بے خبر تھے، اور اُردو شاعری آزادی کے شعور سے پوری طرح آشنا نہ ہوئی تھی۔ محروم کی ابتدائی شاعری میں بھی کہیں کہیں حبِّ وطن کا جذبہ وقتی مصالح کے تحت دب گیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دوسری جنگِ عظیم سے لے کر حصولِ آزادی تک ہماری تحریکِ آزادی کے کئی موڑ ہیں۔ اس تمام سفر کی داستان، سود و زیاں کی اور اُمنگ اور عزم کی پوری تفصیل کے ساتھ محروم کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک آزادی کی تحریک تعلیم یافتہ طبقے اور صنعتی منافع خوروں کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ لوگ انگریزوں کی انصاف دوستی کے

قائل تھے، اور قوم و ملک کی ترقی کے لئے اُن سے اصلاحی نوعیت کی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے قرنِ اوّل میں انگریزوں کی بدنیتی کا راز کھلنے لگا، اور حرّیت پسندوں کی بڑی تعداد سمجھوتے کی روش سے ہٹ کر تشدّد آمیز طریقوں پر اُتر آئی۔ اسی زمانے میں شدید قحط پڑا، اور پلیگ کی وبا سے لاکھوں جانیں تلف ہو گئیں تقسیم بنگال اور لارڈ کرزن کی بدعنوانیوں نے عوام کو مشتعل کر دیا تھا۔ اور ملک بھر میں دہشت پسندوں کی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ حکومت نے ان تحریکوں کو کچلنے کی جتنی کوشش کی، یہ اتنا زیادہ بڑھیں۔ ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں ہندوستانیوں کی ہمدردی میں اضافہ کرنے کے لیے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات شائع ہوئیں۔ غم و غصّے کی اس آگ پر تیل ڈالنے کا کام رولٹ بل نے کیا۔ اس کے خلاف ہندوستان کے سب طبقوں نے متّفقہ طور پر احتجاج کیا۔ جگہ جگہ ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے کیے گئے، اور جلوس نکالے گئے۔ پنجاب میں اس کا زیادہ زور گوجرانوالہ، قصور، اور امرتسر میں تھا۔ امرتسر میں ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں ایک پُر امن جلسے پر جنرل ڈائر نے گولیوں کی باڑ جھونک دی۔ چار سو آدمی وہیں ڈھیر ہوئے، اور ایک ہزار سے زائد زخمی ہوئے۔ اس واقعے نے ملک بھر میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کی برقی رَو دوڑا دی۔ ہزاروں گرفتاریاں عمل میں آئیں، اور سیکڑوں کو پھانسی ہوئی۔ اس کے

دو ماہ بعد تک مارشل لا نافذ رہا۔ پنجاب میں خبروں کے سنسر کی یہ حالت تھی کہ جلیانوالے باغ کے حادثے کی اطلاع لندن میں آٹھ مہینوں کے بعد پہنچی۔ اس حادثے کا اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ اس کے بعد سے تحریکِ آزادی کا دہانہ جیسے یکلخت کئی گنا چوڑا ہو گیا۔ اور ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگ آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔

جلیانوالے باغ کا حادثہ ہمارے آزادی کے سفر کا ایک بڑا ہی دردناک واقعہ ہے۔ شہید ہونے والے چار سو ہندوستانیوں نے قربانی کی جو مثال قائم کی تھی اس ایک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے، اور تحریکِ آزادی کی رفتار دفعتاً کئی گنا تیز ہو گئی۔ شاعر قوم کی آواز ہوتا ہے، محروم اس حادثے کی جائے وقوع سے زیادہ دُور نہیں تھے، انھوں نے اس سے جو اثر لیا، بہت کم شاعروں نے لیا ہو گا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے تین چار نظمیں کہیں۔ یہ سب نظمیں انگریزوں سے نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی ہیں، اور ان کے ظلم اور استبداد کے خلاف دردناک احتجاج ہیں۔ ان میں سے ایک میں محرومؔ جنرل ڈائر کو سعدیؔ کا وہ نکتہ، سعدیؔ ہی کے لفظوں میں سناتے ہیں جو اُنھوں نے گلستان میں ظلم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ ایک اور نظم میں محرومؔ کہتے ہیں کہ جنرل ڈائر کے سفاکانہ قتل کے سامنے نادر شاہ کا قتل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ خود محرومؔ کی زبانی سنئے۔

نادؔر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک   سفّاک اُس کا نام ہے مشہور آج تک

لیکن ہے جورِ نادرِ سفاک سے سوا	ڈائر کے قتلِ عام کا پرہول ماجرا
اس نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو	جو جھک چکی تھی جنگ میں خود اس کے روبرو
ڈائر نے قتلِ عام کیا اس مقام پر	مرتے جہاں ہیں لوگ اطاعت کے نام پر
یورپ لہو سے جن کی ابھی لالہ زار ہے	اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے
ان ہی کے بھائی بند تھے اس باغ میں جہاں	ساون کے بادلوں کی طرح برسیں گولیاں
شامل تھے ان میں پیر بھی اور خورسال بھی	دل میں کسی کے تھا نہ خطر کا خیال بھی
میلہ سمجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی	جمگھٹ عجیب جان کے شامل ہوا کوئی
نکلا تھا کوئی لوٹنے فصلِ بہار کو	آغوش میں لئے تھا کوئی شیر خوار کو
تھی درمیانِ باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ	ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ
پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جان	پتھر کا دل بناؤں تو کچھ ہو سکے بیاں

ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لوہو سے لال دامنِ برطانیہ کیا

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ ہندو مسلم اتحاد کے عروج کا زمانہ تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف علمِ جنگ بلند کیا۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پھیلی اور انگریزی حکومت کو ہندوستان سے ختم کرنے میں وہ کانگریس کے ہم نوا ہو گئے۔ اس اتفاق سے خلافت تحریک کا آغاز ہوا جس نے انگریز دشمنی اور آزادی کے جذبے کو ملک کے کونے کونے

تک پہنچا دیا۔ ہندو مسلمان دونوں کو احساس ہونے لگا کہ ان دونوں کی متفقہ طاقت میں کتنا اثر ہے۔ لیکن محبّت اور آشتی کی یہ فضا زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ انگریزوں کا پھوٹ ڈلوا کے حکومت کرنے کا جو حربہ مدّت سے کمزور پڑ گیا تھا پھر پوری شدت سے اپنا کام کرنے لگا، ترکِ موالات کے دوران میں ہندو مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات سطح کے نیچے چلے گئے تھے۔ لیکن اس کے ختم ہوتے ہی پھر نمودار ہوئے، اور دونوں قوموں میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ ان حالات میں محرؔوم نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا:-

آہ پھر بزمِ وطن میں شورشِ بیہودہ ہے! | ہر مسرّت وقفِ غم ہر عیش خوں آلودہ ہے
اتّحاد ان کو گراں ہے اور نفاق ان کو عزیز | ایک مقصد ہے مگر ہے افتراق اُن کو عزیز
جب کہیں تدبیر لڑ پڑتی ہے لڑ پڑتے ہیں یہ | جب ذرا تقدیر بنتی ہے بگڑ پڑتے ہیں یہ
کاش نخچیں کر دے کوئی سرمستِ جامِ صلحِ کل | لائے نانک کی طرح کوئی پیامِ صلحِ کل

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اخوت اور اتّحاد بڑھانے کے لئے محرؔوم نے کئی نظمیں کہی ہیں، ان میں انگریزوں کی حکمتِ عملی کی طرف اشارے ہیں۔ نفاق کی برائیوں اور اتفاق کی خوبیوں کا بیان ہے، اور متحد ہو کر آزادی کی جنگ جیتنے کی بشارت ہے۔ "ہندو مسلماں" محرؔوم کی ایک طویل نظم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ہم غافل، بے خبر اور بے غیرت ہیں تو ہمیں ہندوستانی کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ ہندو یا مسلمان صرف وہی ہے جس کا کردار صالح ہے اور جس کے دل میں

مذہب کی محبت کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت کا جذبہ بھی موجزن ہے۔

ہندو مسلمانوں کے اس انتہائی نفاق کے زمانے میں ہندوستان میں سائمن کمیشن کا ورود ہوا (۱۹۲۸ء) اس کی تجاویز سے چونکہ آزادی کے راستے میں اڑچنیں پڑتی تھیں، وطن دوستوں نے اس کا بائیکاٹ کیا، اس کے برعکس کچھ انگریز نواز سیاسی پارٹیوں نے کمیشن کے استقبال کی تیاریاں کیں۔ سیاسی انتشار کے اس زمانے میں محروم نے جو نظم کہی، ملک کی بدحالی اور ہندو مسلمانوں کے نفاق کا دل سوز نوحہ ہے۔

ہے مشہور ہندوستاں کا نفاق	مرض ہو گیا ہے پرانا نفاق
عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں	نہیں جانتے اپنا سود و زیاں
نہیں متفق یہ کسی بات پر	تُلے رہتے ہیں اختلافات پر
نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق	نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق
کمیشن کے آنے پہ برپا ہے شور	دکھاتی ہے ہر پارٹی اپنا زور

کوئی کہہ رہا ہے کہ آ سائمن

کوئی چیختا ہے کہ جا سائمن

مجموعی طور پر سارے ملک نے سائمن کمیشن کے خلاف احتجاج کیا۔ دہلی، لکھنؤ، مدراس، کلکتہ، پٹنہ اور لاہور میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پولیس اور مظاہرین میں جو تصادم ہوا، اس میں لاجپت رائے کے لاٹھی کی شدید ضرب آئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سر کی اسی چوٹ کے اثر سے

چند ماہ بعد لاجپت رائے کا انتقال ہوا۔ تحریکِ آزادی کے اس نازک دور میں لاجپت رائے جیسے اہم لیڈر کا قوم سے چھن جانا قیامت سے کم نہ تھا۔ ملک کی نظر میں لاجپت رائے کی قربانی کیا اہمیت رکھتی تھی، محروم کی زبانی سنیئے۔

زعم میں اپنے سمجھ کر پیکرِ فانی تجھے　　　تیرے مرنے پر نہ خوش ہوں بدسگالانِ وطن

لاجپت رائے مبارک ہو یہ قربانی تجھے　　　زندۂ جاوید تو پائندۂ جاوید تو

زندگانی تھی تری شمعِ فروزانِ وطن

موت ہو جائے گی تیری شعلۂ جانِ وطن

بیسویں صدی کے ربع دوم کے آغاز میں آزادی کا جذبہ عوام کے دلوں میں لاوے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ پُرامن تحریکوں کے علاوہ ملک بھر میں دہشت پسندوں کے کئی گروہ مصروفِ پیکار تھے۔ ریل کی پٹریاں اُکھڑی جاتی تھیں اور بم پھینکے جاتے تھے۔ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی میں بم پھینکنے پر بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی گرفتار ہوئے۔ بعد کو اُن پر سنڈرز کے قتل کا بھی مقدمہ چلا، اور سب کو پھانسی دے دی گئی۔ وطن کے ان سرفروشوں کا ذکر محروم کے ہاں کئی جگہ آیا ہے۔ بھگت سنگھ سے متعلق یہ رباعی ملاحظہ ہو۔

شیدائے وطن پیکرِ ایثار آیا　　　زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا

سردار بھگت سنگھ سرِ دار آیا　　　ہے دار و رسن کی سرفرازی کا دن

انگریزوں کی سراسر وعدہ خلافیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف ۱۹۳۰ء میں

سول نافرمانی کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ گاندھی اروِن پیکٹ منظور کرلیا گیا، اور مہاتما گاندھی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ وہاں فرقہ وارانہ انتخاب کے مسئلے پر کونسل کے اراکین سے اختلاف ہوا، اور کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی۔ انگریز فتحِ بنگال کے زمانے سے ہندوستانیوں میں باہم تفرقہ ڈال کر اُن کے استیصال کی جس پالیسی پر چل رہے تھے اُس کا تقاضا یہی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ نفاق پھیلایا جائے۔ چنانچہ ان کے اتحاد کے تابوت میں آخری کیل کمیونل اوارڈ دے کر گاڑی گئی، جو ۱۹۳۲ء میں کانگریس کی شدید مخالفت کے باوجود ہندوستان میں نافذ ہو گیا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی وطن پرستوں نے کمیونل اوارڈ کے خلاف آواز اٹھائی۔ اقبال اس وقت لاہور میں تھے، انھوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور اسے دیوانہ پن کا نام دیا۔ محروم کا یہ شعر اسی تلخیِ دوراں سے عبارت ہے۔

تلخیِ تفرقہ ہر روز بڑھی جاتی ہے
فرقہ واری کا نتیجہ نظر آتا ہے مجھے

اس میں شک نہیں کہ کمیونل اوارڈ نے آزادی کی قریب آتی ہوئی منزل کو دور کر دیا، اور فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے میں مدد دی۔ محروم نے ان سیاسی حالات کا تجزیہ اپنی ایک نظم میں یوں کیا ہے:۔

بھڑکی ہے اس سے فرقہ پرستی کی آگ اور
ہر فرقہ اپنی ڈفلی پہ گاتا ہے راگ اور

ڈھیلی ہوئی سمندِ عداوت کی باگ اور
پھنکارتا ہے آج تعصب کا ناگ اور

ہے اس کے منہ میں زہر کمیونل اوارڈ کا
ہندی ہیں اور قہر کمیونل اوارڈ کا

۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریک نے نہایت شدید صورت اختیار کی۔ ملک بھر اور خصوصاً بنگال میں دہشت پسندوں نے انگریزی اقتدار کو زک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اس موقع پر انگریزوں کی انصاف پسندی اور رعایا پروری کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی کہ بنگال میں شدید ترین قحط رونما ہوا اور یہاں کے عوام کا بڑا حصہ تڑپ تڑپ کے بن آئی موت مر گیا۔ دیدۂ عبرت نگاہ کو یہ صدمہ تازیانے سے کم نہ تھا۔ محروم بھی دل کے درد کے ہاتھوں تلخ نوائی پر مجبور ہوئے اور قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

اے مستِ نشۂ بے خبری حالِ جہاں دیکھ
سرحدِ فنا ہے ہی پہنچا ہے کہاں دیکھ

کیا اہلِ وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے

سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری
یہ جور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری

بنکم کے ترانوں کا وطن نالہ کناں ہے
ٹیگور کے نغموں کا چمن وقفِ خزاں ہے

جس خطے سے اٹھتی تھی صدا حبِّ وطن کی
ملتی ہے اسے آج سزا حبِّ وطن کی

ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی
اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی

محروم کی سیاسی شاعری سے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ تحریکِ آزادی کے مایوس سے مایوس لمحوں میں بھی انھوں نے اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس نصف صدی میں ملک ایسے ایسے مرحلوں سے گزرا کہ بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے، لیکن محروم کی شاعری میں کہیں بھی بے دلی یا حوصلہ شکنی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ جگہ جگہ انھوں نے یقین کی شمع کو روشن رکھا ہے، اور آزادی کی تعبیر پیش کرتے ہوئے آنے والے بہتر دور کی بشارت دی ہے۔ مثال کے طور پر شعاعِ اُمید کے یہ اشعار دیکھئے۔

جلوۂ صبح یقینی ہے شبِ تار کے بعد | دورِ اقبال ہے ہر قوم کو ادبار کے بعد
چھوڑ مت دامنِ اُمید مصائب میں کہ ہے | دستِ گلچیں میں گلِ تر خلشِ خار کے بعد
جہدِ ہستی سے نہ گھبرا کہ نمایاں ہوگا | دورۂ امن و اماں گرمیٔ پیکار کے بعد

محروم کو وطن دوستوں اور سرفروشوں سے گہری عقیدت رہی ہے، انھوں نے ہمیشہ زبانِ شعر سے اُن کی ہمت اور حوصلے بڑھائے ہیں اور ان کی قربانی اور ایثار کے راگ الاپے ہیں۔ ہماری تحریکِ آزادی کیسی کیسی مشکل منزلوں سے گزری ہے، ان مشکلوں پر قابو پانے اور قوم کو کامیابی کی طرف لے جانے میں بڑا ہاتھ ان چند رہنماؤں کا ہوتا ہے جو دُھن کے پکے اور لگن کے سچے ہوتے ہیں۔ یہ مجاہد عوام کے دلوں میں یقین کے شعلے کو سرد نہیں ہونے دیتے محروم نے ایسے مجاہدوں کو ہمیشہ خراجِ عقیدت ادا کیا ہے، اور ان کی عظمت کے

گن گائے ہیں۔ گوپال کرشن گوکھلے، تلک، مہاتما گاندھی، حسرت موہانی ابوالکلام آزاد، سی آر داس اور ایسے دوسرے محبانِ وطن کے بارے میں انھوں نے بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ ان میں سے چند مرثیے بھی ہیں، جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہے گئے ہیں، اور جنھیں پڑھ کر آج بھی دل میں درد کی ٹھیس اُٹھتی ہے۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو رہنمایانِ قوم سے گہری عقیدت اور محبت کی بنا پر کہی گئی ہیں، ایسی نظموں میں موتی لال پر یہ شعر بڑے ہی مؤثر ہیں۔

آہ اے نامدار موتی لال　　نازشِ روزگار موتی لال
ماتمی ہے ترا جہاں سارا　　فخرِ شہر و دیار موتی لال
لال تھا یہ نصیب بھارت کا　　باعثِ افتخار موتی لال
باغِ حُبِّ وطن میں آیا تھا　　بن کے بادِ بہار موتی لال
زندگی تو نے اپنے ہاتھوں سے　　کی وطن پر نثار موتی لال

سبھاش بوس کے بارے میں کہتے ہیں۔

وطن کے لئے بے وطن ہو کے نکلا　　سراپا اسیرِ محن ہو کے نکلا
وقارِ وطن تجھ سے پھیلا جہاں میں　　چمن سے شمیمِ چمن ہو کے نکلا

جواہر لال پر یہ قطعہ آج بھی اتنا صحیح ہے جتنا آج سے بیس برس پہلے تھا۔

گرچہ اے ہمنشیں وطن اپنا　　سیم و زر سے نہیں ہے مالامال
غم نہیں ہے کہ ہے یہاں موجود　　گوہرِ بے بہا جواہر لال

وطن کی آزادی کے سلسلے میں حسرتؔ موہانی کو بھی کئی دفعہ "چکی کی مشقت" کرنا پڑی تھی، ایسے ہی ایک موقعے پر محرومؔ نے کہا تھا۔

اے زندہ شہید حسرتِ موہانی سرکار نے کر دیا تجھے زندانی
لیکن اہلِ وطن کی نظروں میں تو محبوب ہے مثلِ یوسفِ کنعانی

حُبِ وطن سے سرشار ہو کر محرومؔ نے جو نظمیں کہی ہیں اُن میں سے "صبحِ وطن" "اپنا وطن" اور "خاکِ وطن" کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ آخری شعر میں جو رمز ہے، لطفِ بیان کا معجزہ ہے۔

پیدا ہے تیرے سبزہ و گل سے بہارِ خلد کرتے نہیں ہیں تیرے مکیں انتظارِ خلد
لیل و نہارِ ہند میں لیل و نہارِ خلد طالب جو ہے ترا نہیں منّت گزارِ خلد

ہر چند وہ سماں نہیں اور وہ نہیں ہے تو
پھر بھی زمیں پہ رشکِ بہشتِ بریں ہے تو

آزادی کی خیر و برکت کا احساس کرانے اور اس کی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کے سلسلے میں محرومؔ نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں مثنوی "تصویرِ غلامی" اہم مقام رکھتی ہے۔ ساٹھ ستر اشعار کی اس مثنوی میں محرومؔ نے فلسفۂ غلامی کو عام فہم اور نہایت دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے۔ آخر میں بتایا ہے کہ غلام قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب کوئی مردِ مجاہد اپنے عمل اور سوزِ یقین سے مردہ قوم میں پھر سے جان پھونک دیتا ہے۔ مثنوی کے شروع میں غلامی کی مذمّت کی ہے اور اس کی لعنتوں

پر روشنی ڈالتے ہوئے آزادی کی نعمتوں کا احساس دلایا ہے۔

ہے مصدرِ صد گناہ غلامی — جس سے ہو ذلیل ہر گرامی
افراد ہیں بے وقار اس سے — اقوام ذلیل و خوار اس سے
شیروں کو کیا ہے اس نے روباہ — جو کوہ گراں تھے ہو گئے کاہ
مر جاتے ہیں مدرکاتِ علوی — دب جاتی ہیں سب صفاتِ علوی

شہباز اور شیر کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

انساں بھی یونہی غلام ہو کر — رہ جاتا ہے جوہر اپنے کھو کر
گر جاتا ہے مرتبہ بشر کا — دیتا ہے وہ کام گاؤ خر کا
ہر بات میں دوسرے کا محتاج — کیوں کر رکھے اپنے نفس کی لاج
کرتی ہے اختراع و ایجاد — با عزمِ بلند قومِ آزاد
با طبعِ فسردہ قومِ مجبور — رہتی ہے علوِّ فن سے معذور

غرض ان لعنتوں کے خلاف نصف صدی سے ملک میں جو تحریک جاری تھی، کامیاب ہوئی۔ وطن آزاد تو ہوا، ٹکڑے ٹکڑے بھی ہوا۔ اس تقسیم سے جو چنگاریاں اٹھیں تو کتنے ہی مہینوں تک سارا کا سارا ملک شعلہ زار بنا رہا۔ محروم نے اپنی نظم "ناخدائے بے مروت" میں ان حالات کا کتنا صحیح اور پُر تو جائزہ لیا ہے۔

آخری ٹھوکر سے ٹکڑے کر دیئے اس ملک کے — یا اسی برتن کے جس برتن میں کھا کر گیا

پھوٹ کی کل سے حکومت کی دیارِ ہند پر — جب چلا تو اور بھی اس کل کو چلتا کر گیا

چار جانب آتشِ کین و حسد بھڑکا گیا — محشرِ جور و ستم ہر سمت برپا کر گیا

ہند کی کشتی کو چھوڑا حلقۂ گرداب میں — ناخدائے بے مروت خود کنارا کر گیا

صدیوں کے مشترکہ تہذیب و تمدن پر تو قیامت گزر گئی۔ باہمی اخوت اور محبت کے سرچشمے بھی خاک ریز ہو گئے۔ لیکن وطن لاکھ تقسیم ہوا پھر بھی وطن ہے۔

باغ ہیں اجڑے ہوئے گلیاں ہیں شہروں کی اداس — قتل گاہیں بے بسوں کی ہیں ابھی خونیں لباس

جانور سہمے ہوئے ہیں اور انساں وقفِ یاس — دور چہروں سے نہیں اب تک ہوا خوف و ہراس

وہ بھی لرزاں ہیں جنھوں نے چوٹ کچھ کھائی نہیں

کشورِ پنجاب کو تقسیم راس آئی نہیں

انقلاب کے بعد جب پرانا نظام شکست و ریخت ہو جاتا ہے تو نئے کو اس کی جگہ لینے میں کچھ دیر لگتی ہے چنانچہ اس گزراں دور میں محروم آزادی کی شب گزیدہ سحر کو دیکھ کر اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے۔ ان کے لئے دل کے داغوں سے کہیں اہم وہ اجالا تھا جو اپنے جلو میں قوم کے لئے نئی بشارتیں لا رہا تھا۔ اس احساس کے تحت محروم نے آزادی کا استقبال یوں کیا۔

بلندی پہ جب اُڑا اپنا ستارا، وہ پستی جو تھی ننگِ ہستی کہاں ہے

کہ لطفِ خدا سے جہاں آ گیا ہے، زمینِ وطن رشکِ آسماں ہے

گیا وہ زمانہ کہ محکوم تھے ہم، ستم دیدہ بدحال مظلوم تھے ہم
اب آزاد ہیں اور دل شاد ہیں ہم کہ آزاد و آباد ہندوستاں ہے

غرض ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی قومی تحریک کو محروم کی شاعری کے آئینے میں دکھانے کی یہ ایک سرسری سی کوشش تھی۔ اس کا مقصد محروم کی شاعری کے اس پہلو کو بے نقاب کرنا تھا، جس پر ابھی زیادہ لوگوں کی نظر نہیں گئی۔ محروم کی شاعری میں حکیمانہ اقوال اور اخلاقی نکتوں کی افراط سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک اخلاقی شاعر ہیں، حالانکہ یہ اُن کے رنگِ سخن کا صرف ایک ہی پہلو ہے۔ جیساکہ پہلے بیان کیا گیا، محروم کی شاعری کا آہنگ محض انفرادی نہیں بلکہ یہ سماجی اور اجتماعی قدروں کا ساتھ دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک اخلاقی قدروں کا فروغ ہی سب کچھ نہیں، آزادی کا حصول اور اس کے استحکام کی تمنا بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اخلاقی قدریں دراصل ذریعہ ہیں ایک اعلیٰ مقصد کا۔ ہندوستان میں ہم روحانی ترقی سے الگ ہو کر مادی خوشحالی کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ بہتر زندگی اور بہتر مستقبل کی بنیاد اعلیٰ انسانی اور روحانی قدروں ہی پر رکھی جاتی ہے۔ غلامی ان سب کی نفی ہے۔ اس کے برعکس آزادی ان کے پنپنے کے لئے صحیح ماحول پیدا کرتی، اور ان کے فروغ و بقا میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ محروم کی شاعری میں بھی آزادی کی تمنا کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی مدد سے محروم کی آواز کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے، اور ان کے دل کے راز تک رسائی ہو سکتی ہے۔

اُرنگ آباد

۱۹۵۷ء

رباعیاتِ محروم

علی جواد زیدی

رباعی قدیم صنفِ سخن ضرور ہے، لیکن اردو میں اسے مستقل صنف کی طرح
سے کم برتا گیا ہے۔ قدما کبھی کبھی رباعیاں بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس صنف کو
غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس وغیرہ کی طرح نہ تو قبولِ عام ہی نصیب تھا اور
نہ کسی اہم شاعر نے اس کو اپنانے کی کوشش ہی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ،
مثنوی و نظمِ مسلسل تو کیا، رباعی غزل سے بھی زیادہ نازک اور مشکل صنفِ سخن ہے۔
مرثیہ گویوں اور بالخصوص انیسؔ نے اس صنف کی طرف خاص طور سے توجہ کی،
حالیؔ و اکبرؔ نے اس کے عام مضامین میں تنوع پیدا کیا، پھر جوشؔ نے اس کو
رندی و مستی کے اظہار کا آلۂ کار بنایا، اور زمانۂ حاضر میں فراقؔ نے اسے جمالیاتی

آئینہ خانہ بنا دیا ہے۔ رباعی کے اس احیاء میں جن شعراء نے خاص طور سے حصہ لیا ہے اُن میں تلوک چند محروم کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا، اب دوسری بار خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ مجموعے میں ڈھائی سو سے زیادہ صفحات ہیں۔

حضرت محروم اُردو کے کہنہ مشق شاعر ہی نہیں استادِ فن بھی ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے اُن کے بارے میں کہا تھا کہ

لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
اُن کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز

رباعی گوئی میں اُن کے مرتبۂ خاص کا اعتراف اقبال نے یہ کہہ کے کیا تھا کہ ان کی رباعیوں میں فارسی رباعیوں کی سی معنویت ہے۔ ان میں فلسفۂ اخلاق، روحانیت اور مذہب کے باریک نکات کی ایسی متوازن تفسیر ہے کہ پڑھنے والا محظوظ و متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محروم نے صنفِ رباعی کی نزاکت کو اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر کے اور بھی بڑھا لیا ہے کہ وہ رباعیوں میں حسن و عشق اور رندی و سرمستی کے موضوعات کو حلقۂ بیرون در سمجھیں۔ یہ بندش بظاہر پرانی قدروں سے افراط پسندانہ وابستگی کی غماز کہی جا سکتی ہے، لیکن سچ پوچھیے تو یہی ایک "دلِ خوں گشتہ" کی نمائندگی بھی کرتی ہے، اور محروم کی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے

میں مدد و معاون بھی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محروم جن اقدار کے حامی ہیں، اُن میں سے کئی اگلے وقتوں کی ہو چکی ہیں لیکن اُن اقدار کا مشرقی مزاج ابھی ہمارے یہاں جنسِ بیگانہ نہیں بنا ہے۔ بوڑھے تو انھیں سینے سے لگائے ہی ہوئے ہیں، جوان ابھی صرف شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ صرف بعض ہی جراتِ انکار کرنے لگے ہیں، لیکن جو آفاقی اقدار اور عام انسانی اور کائناتی نظریات و محسوسات و تجربات و اخلاق ہیں، اُن کی عمومی کشش سے انکار بھی ناممکن ہے۔

محروم کی رباعیوں میں دنیا کے دل لبھانے والے اندازوں سے باخبر رہنے کی تنبیہہ بھی ہے اور ترقیِ عصرِ حاضر کے بعض پہلوؤں سے اخلاقی اختلاف بھی ہے، بے ثباتیِ دنیا کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی بھی ہے۔ نالِ دنیا کی پُرفریبی آشکار بھی معلوم ہوتی ہے، لیکن جب تک یہ دنیا رنگ و بُو کا گھونگھٹ نکالے ہے حسین بھی تو معلوم ہوتی ہے۔ اس حسین شاعرانہ تضاد کو محروم کی زبانی انھیں کی ایک رباعی میں سنیئے:-

دل عالمِ رنگ و بُو سے بیزار بھی ہے
باقی ہوس و ہوائے گلزار بھی ہے
لیکن اس میں قصور کیا ہے دل کا
دل کش بھی ہے یہ جہان دل آزار بھی ہے

اس احساسِ تضاد کے ساتھ ساتھ اُن کی سنبھلی ہوئی رجائیت بھی قابلِ تذکرہ ہے:

تاخیر مزید، یاس سے اچھی ہے
ہر گفت و شنید، یاس سے اچھی ہے
ہر چند فریب محض ہو، دھوکا ہو
پھر بھی اُمّید، یاس سے اچھی ہے

"رباعیاتِ محروم" موضوعات کے اعتبار سے کئی حصّوں میں منقسم ہیں۔ حمد و مناجات، انسان، مذہب، دنیا، نصائح، کے علاوہ "فکر و نظر" میں خداشناسی ہی کے نکات بیان ہوئے ہیں۔ کچھ حصّہ "جذبات" کا بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن انھیں میں ایسی رباعیاں بھی ہیں:

پھولوں کا نکھار لے کے آئی ہے بہار
گلبانگ ہزار لے کے آئی ہے بہار
پھر ہوتی ہے دل میں اک خلش سی محسوس
شاید کوئی خار لے کے آئی ہے بہار

مرغانِ بہار کی نواؤں کی قسم
امواجِ نسیم کی اداؤں کی قسم
مستی اپنی نہیں ہے ممنونِ شراب
ساون کی مدھ بھری ہواؤں کی قسم

باجوش و خروش آئے ہیں پھر بادل
غارت گرِ ہوش آئے ہیں پھر بادل
فطرت برسا رہی ہے مستی ہر سُو
مے خانہ بدوش آئے ہیں پھر بادل

"پیری" کے عنوان کے تحت جو رباعیاں درج ہیں اُس میں فطری طور سے عمرِ گزشتہ کی تہی دامنی کی نوحہ خوانی ہے۔ لیکن اس میں کچھ رباعیاں ایسی ملیں گی:

لب پر اکثر ثواب کی باتیں ہیں
فکرِ روزِ حساب کی باتیں ہیں
لیکن دل میں بغور دیکھا تو وہاں
اب تک لطفِ شباب کی باتیں ہیں

رباعیوں میں محبت و شباب و مستی کے افسانوں سے گریز کا خاص

سبب یہ ہے کہ یہ محترم کے اس حصۂ عمر میں تصنیف ہوئی ہیں، جب مرحوم کو یہ خیال ستانے لگا کہ

پیری ہے فکرِ عاقبت کر ناداں
کیا فکرِ سخن نجات دلوائے گی

لیکن اسی حصۂ عمر میں زبان پر قدرت اور بیان میں پختگی نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے شائقینِ سخن اس مجموعے کو دیکھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنھیں سیاسی موضوعات اور حالات و واقعات پر مختصر اور با اثر تبصروں کی تلاش ہو، ان کے ذوق کی تشفی کے لئے بھی اس مجموعے میں کافی سامان ہے۔

"نیا دور" (لکھنؤ)

اکتوبر ۱۹۵۶ء

رُباعیاتِ محروم

حامد علی خاں

تلوک چند محروم، برعظیم پاکستان و ہند کے مایۂ ناز اردو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہم بچپن سے اُن کی بلند پایہ شاعری کا آوازہ سنتے آئے ہیں، اور آج تک ان کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ سال بھر سے زیادہ مدت گزری جب اُن کی ایک نظم "دریائے سندھ کی یاد" الحمرا میں شائع ہوئی تھی، اس کی تعریف میں مہینوں دفتر الحمرا کو قارئین کے خط موصول ہوتے رہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ محروم کی رُباعیات کا پیشِ نظر مجموعہ جو پہلے لاہور میں چھپا تھا، اب دوسری بار دہلی میں طبع ہو کر شائع ہوا ہے۔

طبع اوّل کا دیباچہ پروفیسر محمد اقبال مرحوم نے لکھا تھا۔ انھوں نے فارسی

میں رباعی کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو میں اگرچہ شاعری کے دوسرے شعبوں نے بے انتہا ترقی کی ہے، لیکن اس میں حالی اور اکبر کے سوا کسی اور شاعر کا مجموعۂ رباعیات شائع ہو کر مقبولِ عام نہیں ہوا۔ یہ دیباچہ ۲۵۔ اپریل ۱۹۲۲ء کو لکھا گیا تھا۔

طبع دوم کے دیباچے میں جو علّامہ کیفی دہلوی نے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۹ء کو لکھا، علّامۂ محترم فرماتے ہیں کہ

یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے رباعیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں، ایسے اور اتنے مجموعے اُردو میں نظر نہیں آتے، لیکن کہنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ فارسی اور اُردو کی عمر میں کتنا فرق ہے۔ پھر بھی اردو نظم کا ذخیرہ رباعیوں سے خالی نہیں۔ میر انیس نے بہت سی رباعیاں کہیں اور ایسی کہیں کہ رباعی کہنے کا حق ادا کیا۔

رباعیوں کے دو اور مجموعے اس صدی میں شائع ہوئے ہیں جو بہت قابلِ قدر ہیں۔ ایک کے مصنف حضرتِ رواں لکھنوی ہیں، اور دوسرے کے اثر صہبائی۔

حضرتِ جوش ملیح آبادی نے بھی ’رباعیاتِ محروم‘ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھیں رباعی گوئی کی مشکلات کا احساس اور حضرتِ محروم کی قادر الکلامی کا اعتراف ہے۔ مگر وہ حضرتِ محروم کی روحانیت پر ع

صلاحِ کار کجا و من خراب کجا

کی پھبتی کسے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کا جواب جناب محرومؔ شاید اپنی زبان میں یہی دیں گے ع

اس "دَورِ کمالات" میں پسپا ہوں میں

"صلاحِ کار" غالباً محروم کی ان رباعیات میں بھی محسوس ہوئی ہوگی ؎

لاہور میں لوگ آرٹ فرماتے ہیں — دوشیزہ کو رقصِ ناز سکھلاتے ہیں
یہ آرٹ وہ ہے کہ جس پہ شرم اور حیا — غیرت سے زمین میں گڑے جاتے ہیں

دوشیزہ سرِ بزم اگر ناچے گی — گرد اُس کے ہوس کار نظر ناچے گی
کھا جائے گی لغزش نگہِ پاک وہیں — جس وقت وہ لچکا کے کمر ناچے گی

یہ ملک تھا پاک آتماؤں کا وطن — یا دیویوں اور دیوتاؤں کا وطن
مغرب کی پیروی سے رفتہ رفتہ — بنتا گیا خوب رُو بلاؤں کا وطن

لیکن بقول حضرت کیفی مدظلہٗ، محرومؔ صاحب خیر سے نرے زاہدِ خشک نہیں ہیں، کس تڑپ کے ساتھ کہتے ہیں:-

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں — ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد دیں گزری ہوئی برساتوں کی — آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں

ہلکی سی پھوار اور کنارِ دریا یا صبحِ بہار اور کنارِ دریا
قسمت سے ملتے ہیں کسی کو محرومؔ ساون، اشجار اور کنارِ دریا

رُباعی کی سب سے بڑی فنی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے چوتھے مصرع سے چونکا دینے کے انداز میں کوئی بڑا فکری انکشاف ہوتا ہے۔ حضرتِ محرومؔ کی رباعیاں فنی کمال کی اس کسوٹی پر بھی پوری اُترتی ہیں۔ ختمِ کلام سے پہلے اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے یہ ڈوب کے ہیں پار اُترنے والے
بے خوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

دنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے اس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن الزامِ گناہ سے بہت ڈرتا ہے

"الحمرا" (لاہور)
مارچ ۱۹۵۵ء

رباعیاتِ محروم

رضا انصاری

اُردو ادب میں شاعری کی ایک خاص صنف رباعی کی طرف اتنی توجہ نہیں کی گئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ رباعی یعنی صرف چار مصرعوں میں کسی نازک یا اہم خیال کو کامیابی کے ساتھ ادا کر لینا اس وقت تک شاعر کے لیے آسان نہیں ہوتا جب تک وہ زبان کی ساری نزاکتوں اور اظہارِ خیال کے تمام پیچیدہ راستوں پر پوری طرح حاوی نہ ہو۔

تلوک چند محروم اردو زبان کے کہنہ مشق خوش فکر اور سنجیدہ شاعر وسیع تجربہ، مخصوص طریقۂ فکر اور اپنے معیاری ذوق کے پیشِ نظر رباعیات کی طرف اگر متوجہ ہوئے تو اس کا انھیں پوری طرح حق بھی حاصل تھا۔

زبان اور خیال کے علاوہ وہ خاص چیزیں جو شاعر یا ادیب کے فن کو توانائی بخشتی ہیں، یعنی خلوص اور اعتقاد، محروم صاحب کی شاعری اور زندگی کی وہ ممتاز خصوصیتیں ہیں جن کی بدولت ان کی رائے اور فکر سے اختلاف رکھنے والا بھی اُن کے فن سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

خلوص اور عقیدے کی اہمیت کے اس منکر زمانے میں محروم صاحب کی خلوص کی کھنک اور عقیدے کی مہک رکھنے والی آواز بہت سے دلوں کے لئے تسکین کا سامان بن سکتی ہے۔

زیر نظر کتاب "رباعیات محروم" جو پہلی بار ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی، اور اب دوسری بار دہلی سے چھپی ہے، محروم صاحب کی اس کھری سچائی کی آئینہ دار ہے، جس میں کھوٹ کا ادنیٰ میل بھی نہیں ہے۔ وہ سچائی جس کی پیشانی پر ہندوستان کی تقسیم کے دور میں بھی نفرت کی کوئی شکن نہیں اُبھری، اور وہ سچائی جو محروم صاحب کے آوارۂ وطن ہوکر دربدر گھومنے کے سنگین وقت میں بھی محبت اور دوستی کی پیغامبر بنی رہی۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی نے بہت پہلے کہا تھا۔

ہے داد کا مستحق کلام محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

لفظوں کے جمال اور معانی کے ہجوم کے ساتھ ان کے کلام میں عقیدے

کی گرمی اور اخلاص کی تڑپ نے جو کیفیت پیدا کردی ہے اس کا اندازہ "رباعیاتِ محروم" کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ جس میں 'حمد و مناجات' 'انسان' 'مذہب' 'شعر و شاعری اور جذبات وغیرہ عنوانوں کے تحت گراں قدر خیالات ملتے ہیں۔

"قومی آواز" (لکھنؤ)

۲۸۔ مارچ ۱۹۵۵ء

تلوک چند محروم

پرمان سنگھ

ایک دن میں نے جنابِ محروم سے استفسار کیا۔ کہ آپ کے خیال میں آپ کی بہترین نظم کونسی ہے؟ تو اُنھوں نے ایک ایسی نظم کا نام لیا جس کو میں نے کبھی خاص اہمیت نہ دی تھی مگر اس خیال سے کہ شاعر اپنی کسی نظم کو بلا وجہ اپنا شاہکار تصور نہیں کرتا، میں نے "مدرسہ کی یاد" کا بغور مطالعہ کیا، اس کے متعلق میری رائے میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی، مگر اتنی بات ضرور ہوئی کہ محروم کے لڑکپن اور زمانۂ مابعد کی نسبت ایک نکتہ ہاتھ آیا، اور وہ یہ کہ لڑکپن محروم کا نہایت پُر مسرت زمانہ تھا۔ لیکن بعد میں محروم کا دل ناگفتہ بہ مصائب کا شکار ہوا، اور اس رنج والم نے عہدِ طفلی کی یاد میں اور تڑپ بھر دی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

یاد آیا میکہ خوش طفلِ دلِ بے چارہ تھا | میری اُمیدوں کا تو اے مدرسہ گہوارہ تھا
آہ جب میں واقفِ حسرت تہلۂ گوناگوں نہ تھا | آہ جب میں واقفِ نیرنگیئے گردوں نہ تھا
میری نظروں میں تھی جب دنیا مسرت کا مقام | ہاں یہی دنیا جواب ہے لاکھ عبرت کا مقام

محروم کی نظموں میں اس قدر سوز ہے کہ بعض حضرات نے سوز و گداز کو ہی کلامِ محروم کی خاصیت ٹھہرایا ہے۔ مگر شاعری اور سوز و گداز لازم و ملزوم ہیں جس شعر میں سوز نہیں وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں، شاعر کا دل ایسے ارمانوں سے پُر ہوتا ہے، جن کے نکلنے کی توقع ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اکبر کی ہنسی اقبال کے گریہ سے کم دلگداز نہیں۔ یہ درست ہے کہ کلامِ محروم میں معمول سے زیادہ سوز ہے، مگر سوز کو کلامِ محروم کی خاصیت ٹھہرانا تنقید میں داخل نہیں۔

محروم کے ابتدائی کلام میں اُمید اور مسرت کا بے پناہ طوفان ہے۔ شاعر کا دل دردِ قومی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ مگر اس خیال سے کہ اس درد کا مداوا ہونے والا ہے، وہ مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے، اور محروم جوشِ طرب میں گانے لگتا ہے۔

وہ دن بھی نہیں ہیں دور کہ جب بھارت کا ستارا چمکے گا
دیکھے گا مغرب مشرق کو جب بخت ہمارا چمکے گا
پھر اوجِ سپہرِ قومی پر اقبال کے تارے چمکے ہیں
کہتے ہیں منجم دنیا کے یہ دلیش دوبارا چمکے گا

مصنوعی تری تہذیب ہے اے مغرب! اس پر ناز نہ کر
تارے کی طرح گو اوج پہ ہو کیا خاک غبار اچھلے گا

محروم عنفوانِ شباب میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور گریہ وزاری کرنے کا عادی نہ تھا۔ مصائبِ ملی کو دیکھ کر اس کا خون جوش میں آتا ہے۔ وہ فلسفہ قنوطیت سے ناآشنا ہے۔ اُسے برادرانِ وطن کی ہمت پر اعتماد ہے، اور ان میں ذوقِ عمل پیدا کرنے کے لیے بول اُٹھتا ہے۔

یہ مجبوری و بے نوائی کی باتیں	یہ ناطاقتی نارسائی کی باتیں
زمانے کی بے اعتنائی کی باتیں	یہ ہیں سربسر جگ ہنسائی کی باتیں

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

محروم کا دل حبِ وطن کے جذبات سے لبریز ہے۔ وطن کے پُرفضا میدانوں مترنم اور متلاطم دریاؤں، ہیبت ناک پہاڑوں اور دیگر مناظرِ قدرت کو دیکھ کر محروم کے دل میں مسرت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ اُسے صبح و شامِ وطن سے انوکھا کیف حاصل ہوتا ہے۔ اس کے قلم میں اتنا زور ہے کہ اس کیف کو شعر کا جامہ پہنا کر ہمارے دلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ "شامِ وطن" سے دو بند پیش کرتا ہوں۔

کیا سانولی صورت ہے تیری	اے شامِ وطن، اے شامِ وطن
کیا موہنی مورت ہے تیری	اے شاہدِ لیلےٰ فامِ وطن

واپس چرپائے چرواہے کھیتوں سے گھروں کو آتے ہیں
گھنٹی کی صدا سے کانوں سے کیا دل کو لوٹے جاتے ہیں

میانوالی پنجاب کا ایک دور افتادہ ضلع ہے۔ شعروشاعری تو درکنار، وہاں تعلیم بھی عام نہیں۔ اُردو کا چرچا وہاں بہت کم ہے۔ اسی پسماندہ ضلع کو محروم کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی صحرا میں بقول سر عبدالقادر "خدا نے وہ خودرو پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی"۔ کلامِ محروم کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، آپ کو غیر فصیح الفاظ اور تراکیب مطلق نظر نہ آئیں گے۔ محاورہ اور روزمرہ کو دہلی اور لکھنؤ کے کہنہ مشق استادوں کی طرح باندھتے ہیں۔ "توصیفِ لالہ و گل" اور "خرامشِ بادِ صبا" تو روزِ ازل سے شاعروں کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ ایسے حسین مناظر کے دوش بدوش محروم نے آندھی کا منظر بھی دکھایا ہے، اور اس غیر شاعرانہ مضمون کو بھی محروم کے قلمِ جادو رقم نے گل و لالہ کی سی دل کشی عطا کی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

وہ گرد کا پہاڑ اُٹھا پھر شمال سے بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے
رو پوش اُس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہوا

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھنکارتی للکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی

ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم اُبھارتی　　اُڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اُتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھپاتی ہوئی چلی

ہلچل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ محروم کا قلم جس چیز کو بیان کرتا ہے سماں باندھ دیتا ہے۔ محروم کے کلام میں بیسیوں تصویریں ہیں۔ مگر وہ ساکن و جامد نہیں، بلکہ چلتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ اُن میں رنگ کے ساتھ ساتھ بُو، صوت اور حرکت بھی ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو شاعری کو مصوّری سے ممیّز کرتی ہیں۔

مذہب کے لحاظ سے جنابِ محروم بہت فراخدل واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے بزرگوں کی عظمت کو محسوس کیا ہے، اور اُسے نظم کیا ہے۔ میں نے اُنھیں مختلف مذاہب کی کتبِ مقدسہ کا مودبانہ مطالعہ کرتے دیکھا ہے ایک دفعہ اُنھوں نے کہا، جی چاہتا ہے کہ مسیح کے متعلق اپنے جذبات کو نظم کردوں ع

فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

وہ ربوبیتِ الٰہی اور اخوتِ انسانی کے قائل ہیں، اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنا انسان کا فرضِ اوّلین تصور کرتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تعریف و توصیف میں مسلمان اتنا ہی مبالغہ کرتے ہیں جتنا ہندو اس کی مذمت

ہیں۔ محروم نے دونوں فرقوں کے متعصب افراد کو اس معاملے میں رواداری کا
سبق دینے کے واسطے ابنِ یمین کے مندرجہ ذیل شعر کی تضمین کی ہے ؎

ہر کہ با زندہ از پئے مردہ — می کند جنگ سخت ناداں است

عینِ شباب میں محروم کو ایسے صدمات پیش آئے جنھوں نے ان کی شاعری
کو نغمۂ شادی سے نوحۂ غم میں تبدیل کر دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات اور دیگر قومی مصائب
نے وطن کے متعلق محروم کی امیدوں کا خون کر دیا۔ ان واقعات کا محروم کے دل پر
ویسا ہی اثر ہوا، جیسا انقلابِ فرانس کا ورڈزورتھ کے دل پر ہوا تھا۔ اس کے
خیال میں یہ انقلاب بنی نوع انسان کی آزادی کا پیش خیمہ تھا لیکن انقلابیوں کی
بے اعتدالیوں سے ورڈزورتھ کا توازنِ ذہنی جاتا رہا۔ اس کی بہن کی بے لوث
خدمت نے ورڈزورتھ کو بچا لیا۔ محروم اتنا خوش قسمت نہیں۔ اسے مصائبِ ملّی کے
ساتھ ساتھ مصائبِ ذاتی بھی برداشت کرنے پڑے۔ ان کی نوجوان بیوی
کی موت سے اُن کے دل میں "طوفانِ غم" اُمڈ آیا۔ گرامی، طالب، سرور، نادر
اور چکبست جیسے ہمنواؤں کی وفات نے محروم کو "ترجمانِ دلِ بیقرار" بنا دیا۔ ان
ایام کے کلام میں الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی کے
ساتھ ساتھ سوز بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسے پڑھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ محروم
کا قلم جہاں عیش و نشاط اور امید کی تصویر بنا سکتا ہے، وہاں غم و اندوہ کا نقشہ
کھینچ کر قاری کے دل میں سوز و گداز کا طوفان بھی برپا کر سکتا ہے۔ محروم کی مشہور نظم

"نورِ جہاں کا مزار" اسی زمانے کی کہی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی "خوابِ جہانگیر" ہے۔ جس کے دو بند پیش کرتا ہوں۔

مژدۂ عیش نسیمِ سحری لائی ہے — دوش بر دوش صبا نکہتِ گل آئی ہے

بزمِ قدرت میں عجب شانِ دل آرائی ہے — وقتِ مینو شی ہے اے شاہ گھٹا چھائی ہے

منتظر محفلِ عشرت ہے شہا جاگ کہیں

اے صبوحی کشِ مستانہ ادا جاگ کہیں

آہ طاری ہے یہ کیا خوابِ گراں متوالے — نہیں سنتا جو رعیت کی فغاں متوالے

کس تصور میں ہے؟ پھرتا ہے کہاں؟ متوالے — دیدۂ خلق سے کیوں ہو گئے نہاں متوالے

چھوڑ کر تختِ شہی زیرِ زمیں جا سویا

بدلی کروٹ بھی نہ صدیوں سے یہ اچھا سویا

"طوفانِ غم" سے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

محروم یہ تو تجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم — جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی — اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

محروم نے عزیزوں کی بے وقت موت پر آنسو بہائے، اور ان کے آنسو گوہرِ آبدار بن کر ادبِ اردو کی زینت بنے۔ جب شاعر رنج و غم پر قابو پالیتا ہے تو اسے شعر میں مقید کر دیتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ جب غم کا اظہار کر دیا جاتا ہے، تو وہ جانکاہ نہیں رہتا۔ محروم نے عہدِ شباب میں رنج و محن کا شعر میں اظہار

کیا۔ مگر عالمِ جوانی کے ساتھ ساتھ دل کی تاب و تواں بھی رخصت ہوئی۔ قضا کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُس نے ایسی حالت میں بھی محروم کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ اُن کی نوجوان لڑکی اُنھیں داغِ مفارقت دے گئی۔ اس صدمہ سے اُنھیں کتنا رنج ہوا میرا قلم اس کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ میں ان سے ملا تو فرمانے لگے "بھئی بہت صدمہ ہے۔ مگر اب کے تو میرا دل جل کر راکھ ہو گیا، میرے آنسو خشک ہو گئے" اُن کی دلی کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اب تک اس جواں مرگ کے متعلق کوئی نظم نہیں کہہ سکے۔ ایک دفعہ ایک جلسے کی صدارت کرنے کے لئے اُن سے پُرزور التجا کی گئی تو اس تازہ صدمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ازراہِ معذرت لکھ بھیجا ؎

تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر
ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

دو باتیں عرض کرنا باقی ہیں۔ اُن کے تازہ مجموعۂ کلام "گنجِ معانی" کی ترتیب خالی از نقص نہیں۔ اُس میں نظموں کو موضوع کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے۔ اگر انھیں اسی ترتیب سے پیش کیا جاتا جس میں وہ کہی گئی تھیں تو "گنجِ معانی" یکسانیت کے عیب سے معرّیٰ ہو کر تنوّع کی حامل بن جاتی اور اس سے شاعر کے ارتقا کا بھی صحیح اندازہ ہو سکتا۔

میرے خیال میں اب یہ کہنا بے جا ہے کہ ع

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

اُردو ارتقا کی انتہائی منازل پر پہنچ چکی ہے۔ پنجاب بھر کے لئے عموماً اور ضلع میانوالی کے لئے خصوصاً یہ امر باعث فخر ہے کہ حضرتِ محروم اُردو کی مشاطگی میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ہماری دعا ہے کہ اُردو کے اس دیرینہ کرم فرما کو خدا دیر تک سلامت رکھے، اور انھیں توانائی بخشے کہ وہ اس پیاری زبان کی اور زیادہ خدمت کر سکیں۔

راولپنڈی

دسمبر ۱۹۳۹ء

رُباعیاتِ محروم

پرمان سنگھ

"گنجِ معانی" کی اشاعت (۱۹۳۲ء) کے بعد اردو شاعری میں ایک بہت بڑا انقلاب آیا۔ اس سے صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے شعر کی ہیئت میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ اشتراکیت نے مزدور اور کسان کے حق میں اور سرمایہ دار کے خلاف جذبات کا ایک طوفان کھڑا کیا۔ فرائڈ کے جنسی نظریئے کے زیرِ اثر جہاں ہمارے سماج کی بہت سی فرسودہ اور لایعنی رسوم پر کڑی نکتہ چینی کی گئی، وہاں اردو ادب میں عریانی کا عنصر بھی داخل کیا گیا۔ تحریکِ وطنیت نے بھی ہماری شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ فارسیت اور عربیت کی جگہ ہندیت نے لے لی یعنی دیسی معاشرت کو موضوعِ سخن بنایا گیا، اور بہت سے عربی اور فارسی الفاظ پر سیدھے

سادے اور عام فہم ہندی الفاظ اور محاورات کو ترجیح دی جانے لگی۔ رمزیت اور ہندی الاصل تشبیہوں اور استعاروں نے اردو شاعری کو ایک نئی چاشنی دی۔ جدید خیالات کے اظہار کے لئے نئے نئے اسالیبِ بیان تراشے گئے، اور نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد کو فروغ دیا گیا۔

محروم اب تک اپنی قدیم روش پر گامزن ہیں۔ تاہم وہ اس نئے انقلاب کے اثرات سے بالکل محفوظ نہیں رہ سکے۔ چنانچہ وہ اشتراکیت کے مرکزی خیال کو اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کرتے ہیں۔ رباعی

دنیا میں برائے مردمِ کم مقدار	اہلِ شوکت ہیں باعثِ صد آزار
راہوں میں رہروانِ منزل کے لئے	اُڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار

عریانی ہماری نئی معاشرت کی ایک خصوصیت بن چکی ہے۔ چونکہ ادب تنقیدِ حیات کے ساتھ ساتھ زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ اس لئے ہماری شاعری میں عریانی کو ترقی پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محروم ایک وضع دار شاعر کی حیثیت سے معاشرتی اور ادبی دونوں قسم کی عریانی سے سخت بیزار ہیں، اور اپنا ردِ عمل چند خوبصورت رباعیوں میں پیش کرتے ہیں۔

ہندیت کے بارے میں محروم میانہ روی کے قائل ہیں۔ ان رباعیات میں ہلکی ہلکی پھوار، ساون کی برسات اور کالی کالی گھٹائیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہندستان کی نکلتی ہوئی ندیاں، لچکتے ہوئے اشجار اور چٹکتی ہوئی کلیاں

جلوہ نما ہیں۔ کوئل کی کوک اور پائلوں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔ مگر زبان کے معاملے میں محروم قدیم اساتذہ کے زیادہ قریب ہیں۔ اُن کے طرزِ تحریر میں فارسیت اور عربیت کے عناصر غالب ہیں تاہم وہ فصاحت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔

بے بصیرت لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ مذہبی احکام چوبِ خشک کی طرح لچک سے بالکل عاری ہیں۔ مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انسان کے روحانی ارتقاء کے ساتھ مذہبی احکام کی تاویل بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ ابتدا میں اقبال کی جبینِ نیاز میں حقیقتِ منتظر کے واسطے ہزاروں سجدے تڑپتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر بعد میں وہ خدا سے ہرجائی ہونے کا شکوہ کرتا ہے، اور رفتہ رفتہ روحانی ارتقا کی مختلف منازل تیزی کے ساتھ طے کرتا ہوا آخر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں خدا بندے کی رضا کا پابند معلوم ہوتا ہے۔ اب اقبال کمالِ نیازمندی سے سربسجود ہونے کی بجائے سراپا ناز بن کر اپنے خالق سے کہتا ہے ؏

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ان رباعیات میں محروم کے روحانی ارتقاء کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ وہ حسبِ معمول گڑگڑاتے ہوئے سجدے اور رحمت کی طلب سے اپنا روحانی سفر شروع کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ سجدوں کی نسبت حسنِ عمل کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے، اور آخر عمل کو ہی اپنا مقدر سمجھ لیتا ہے۔ مگر اس مسلک پر محروم اتنا تیز گام نہیں جتنا کہ

ایک حساس شاعر کو ہونا چاہیئے۔ وہ جبر و اختیار کے پیچیدہ مسئلے کو یوں سلجھاتا ہے۔ رباعی

مختار تھا، کر گیا جو دل کو بھایا ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا یوں عالم اختیار میں جبر آیا

محروم کا کلام سوز و گداز سے لبریز ہے۔ مگر محروم سے مل کر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اُس کی زندگی مسکراہٹوں اور قہقہوں سے خالی نہیں۔ اُسے بہت سے جانکاہ صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ شاید وہ اپنی ہنسی ہی کی بدولت اب تک زندہ ہے۔ نہ جانے محروم کی شخصیت کا ظریفانہ پہلو اب تک اُس کے کلام میں جلوہ نما کیوں نہیں ہوا تھا۔ ان رباعیات میں پہلے پہل محروم کے مزاج کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

مصنوعی دوائیں جب مسیحا بیچیں
کیوں کر نہ ہو دردِ عاشقی مصنوعی

نفسیاتِ جدید نے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ سوز و گداز اور مزاح ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ان دونوں کی اصل انسانی ہمدردی ہے۔ جو کبھی آنسوؤں کی شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی ہنسی کی۔ اسی لیے چیسٹرٹن نے کہا تھا کہ کچھ لوگ اپنے آنسوؤں کے ذریعے ہنستے ہیں اور کچھ اپنے قہقہوں کے ذریعے روتے ہیں۔ جب مسکراہٹیں اور قہقہے کسی انسان کو کردارِ غلط سے

باز رکھنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں تو مزاح ذرا درشتی سے کام لے کر طنز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ محروم لاہور کی شریف زادیوں کے رقص پر دبی چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ع

لاہور میں لوگ آرٹ فرماتے ہیں

مگر فوراً سنبھل کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دیوانہ کہیں گے اِس زمانے کے لوگ محروم زمانے کی ہوا سے نہ لڑو

مگر محروم صاحب! دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس نازک معاملے میں جنگ آزمائی کی ضرورت بھی ہے؟ کیا آپ اکبرؔ کی یہ بات بھول گئے ہیں۔ ع

کیوں کر کہوں کہ اچھا ہے جیٹھ کا نہ ٹپنا

اِن رباعیات میں قوسِ قزح کی سی رنگ آمیزی ہے۔ شاعر نے مذہب، فلسفہ، اخلاق، فطرت، معاشرت، ادب وغیرہ سے متعلق اپنے احساسات پیش کئے ہیں۔ محروم اساتذۂ قدیم کی یادگار ہے۔ تاہم اس کا کلام قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔ اور اردو ادب کے ارتقا میں ایک اہم سنگِ میل کا رتبہ رکھتا ہے۔ اس لئے اردو شاعری کا مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

رباعیاتِ محروم کو اُردو کے اعلیٰ امتحانوں کے نصاب میں بخوبی داخل کیا جا سکتا ہے۔

راولپنڈی
مارچ ۱۹۴۸ء

محروم اور فلسفۂ غم

جے کرشن چودھری

محروم کی شاعری کا سب سے پُرزور نغمہ اُس کا بیانِ غم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کے اثرات اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں، اور انھوں نے اس کے تخیلات کی دنیا کو آہ و فغاں سے معمور کر دیا ہے۔

انگریزی کے شہرۂ آفاق شاعر شیلے کے اس نظریے میں کہ "ہمارے سب سے زیادہ شیریں گیت وہ ہیں جو انتہائی جذبۂ غم کا بیان کرتے ہیں" محروم کی ہردلعزیزی کا راز پنہاں ہے۔

شاعر انسان کے جذبات کا ترجمان ہے۔ اس کا درجہ اتنا ہی بلند اور رفیع ہوتا ہے جتنا کہ وہ انسانی دل کی گہرائیوں اور پوشیدہ جذبات کے

آشکارا کرنے میں ہمارا ممد و معاون ہوتا ہے۔

محبت، حسد، رشک، خوشی اور غم کے جذبات یوم تخلیق سے ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ محبت سے بڑھ کر نہیں تو اس جذبے کے قریب قریب غم کا جذبہ انسان کے دل میں تلاطم بپا کر دیتا ہے، اور کوئی جذبہ اتنی شدت سے انسان کے دل پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ خوشی کے جذبات چند لمحات تک رہتے ہیں، لیکن دُکھ درد کے جذبات جاں گسل اور دیرپا ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ زمانہ خود بخود زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن ذرا سی نئی تکلیف ان کو پھر ابھرا کر دیتی ہے، اور دنیا میں قہقہوں کے ساتھ آنسوؤں کی جھڑی بھی ہے۔ ایک شاعر کے لئے یا بالفاظِ دیگر ایک حساس شخص کے لئے دنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے۔ اس کا قہقہہ بھی آنسوؤں سے آزاد نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

باران غم سے جب گلِ آدم بھگو چکے
اک قطرہ عیش کا بھی ملایا خمیر میں

اس واسطے میرے خیال میں جو شاعر ہمیں اِس اوّلین فطری جذبے سے لذت اندوز کراتا ہے وہ ہمارے دل کے عمیق اور نازک تاروں کو چھیڑتا ہے۔ یقیناً ایسے شاعر کا کلام دیرپا ہوتا ہے۔ شاعر کا کام ہمیں محض ہنسانا یا تفریحِ طبع کا سامان پیدا کرنا نہیں۔ یہ تو ایک معمولی درجے کا مزاحیہ نویس بھی کر سکتا ہے۔ اگر شاعر کے کلام میں سوز نہیں، جذبات کی فراوانی

نہیں، دل کی شکست کی آواز نہیں یا درد وکرب کی تصویر نہیں تو وہ شاعری نہیں۔

غالب کے کلام کی جاذبیت کی یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کو اُس کے کلام میں اپنی پُرحسرت اور پُردرد زندگی کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔ ہر شعر اُس کو حسب حال دکھائی دیتا ہے۔ کون ہے جسے دنیا میں کانٹوں سے اُلجھنا نہیں پڑا۔ جسے درد و غم، حسرت و یاس سے پالا نہیں پڑا۔ جسے آنسوؤں کے موتی پرونے نہیں پڑے۔ کیا غالب کا ذیل کا شعر ان کے واسطے آہنگِ بے ہنگام ہو سکتا ہے؟ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اس شعر میں سوز کا ایک سمندر ہے بے پایاں اور تسکینِ قلب کا ایک سرچشمہ ہے ابدی اور رُوح پرور۔ زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غالب موت کو قاطعِ آلام سمجھتا ہے۔ لیکن محروم کا زاویۂ نگاہ موت کے متعلق قدرے مختلف ہے۔ محروم اُس کی تباہ کاریوں، اس کی جفاکیشیوں اور اُس کے مظالم کو ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح دیکھتا ہے۔ موت محروم کی نظر میں دنیا کے رنج و محن کا آخری تاریک اور نہایت ہی خوفناک انجام ہے۔ جس سے بچنے کے لئے وہ بچے کی طرح سعیِ لاحاصل کرتا ہے، کبیر کی طرح اس کے دل سے موت کے لئے خوش آمدید کی آواز نہیں نکلتی ؎

جا مرنے سے جگ ڈرے، میرے من آنند
کب مریہوں کب پالیوں پورن پرم آنند

کبیرا اپنے محبوب کے وصل کی اُمید میں موت سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے، ٹیگور موت کو اپنے مالک کا پیغامبر خیال کرتا ہے، اور خوشی کے ترانے گاتا ہے۔ لیکن محروم کے دل میں یہ خوشی کا ولولہ نہیں۔ گو اس نے کسی کسی جگہ موت کے متعلق گیتا کے نظریے کو نظم کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گیتا کی تعلیم نے محروم کے دماغ پر تو اثر کیا ہے لیکن دل پر نہیں۔ "موت" کے عنوان سے آپ اُن کی نظم پڑھئے۔

موت کے مظالم کی حسرت بھری تصویریں کھینچی ہیں، اور اُن کے آخر میں گیتا کی فلاسفی سے دل کو تسکین دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسے کہ سانپ کے ڈر سے سہمے ہوئے بچے کو کوئی بھولا ہوا منتر یاد آجائے۔ دراصل محروم نے موت کو شاعر کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا، ایک عام آدمی کے خیال سے دیکھا ہے، اور اس پہلو سے اس کی تصویریں نہایت قابلِ قدر ہیں ؎

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دُور — ماں باپ سے بہت پرے بھائی بہن سے دُور
لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دُور — دستِ صدائے شیون و شورِ محن سے دُور
پھولوں کی آہ نازبھری انجمن سے دُور — گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دُور

موت کی وادی کی کیا ہی پُرحسرت تصویر ہے۔

موت کی اس قسم کی دردناک تصویریں میرے خیال میں اُس ذاتی صدمے کا نتیجہ ہیں۔ جو محروم کو عین عالمِ شباب میں اپنی بیوی کی موت سے پہنچا ہے۔ یہ صدمہ اُس وقت ہوا جب اوائلِ شباب کی مسرّتوں سے امید و آرزو کے گلبن کھلتے ہیں، اور حسرت و یاس کے خار پہلو میں نہیں کھٹکتے۔ ایسے وقت میں اپنے حبیب کی موت اپنی آرزوؤں کی موت معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ درد اتنا جگر سوز ہوتا ہے کہ اس کا اثر ساری زندگی پر چھا جاتا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ کوئی تسکین نہیں۔ کوئی الفت کا سامان نہیں۔ آپ محروم کی نظمیں جو "طوفانِ غم" کے نام سے کہی گئی ہیں پڑھیے۔ آپ کو شاعر کی شدّتِ غم کی حقیقت اور اس کے بیانِ غم کی چابکدستی معلوم ہوگی۔ میں نے اس حصۂ نظم کو کئی دفعہ پڑھا ہے، اور ہر دفعہ میں دردِ غم کے کرب سے چیخ اُٹھا ہوں ؎

کسی کے پھول جو گنگا میں ہم بہا کے چلے جگر پہ آہ نئے داغ اور کھا کے چلے
وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے کنارِ گنگا پر کہ نہر پہلوئے دریا میں اک بہا کے چلے
گھٹا نہ آہ ذرا بھی تو سوزِ پنہانی! پلٹ پلٹ کے نہائے نہا نہا کے چلے
چلے ہیں ویسے ہی جیسے کہ آئے تھے محروم وطن کو بادلِ غمدیدہ پھر پھرا کے چلے

موت کے مقابلے میں انسان کی ہستی کتنی بے مقدار ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن رشتے یہ جتنے اُلفت و مہر و وفا کے ہیں
محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی　　　اشکوں کو کیا کروں کہ وہ خود سر بلا کے ہیں

یہ صدمہ اُن کے لیے سوہانِ رُوح بن گیا ہے، اور یہی اُن کی شاعری کی رُوح بنا ہے

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے　　　(اقبال)

بہر حال کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ اس روح فرسا صدمے کی وجہ سے محروم کی شاعری انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ کہیں دوستوں کی وفات پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ کہیں ان کی جو کبھی جاہ و حشمت کے مالک تھے، اور موت کے بے رحم ہاتھوں سے گوشۂ خاک میں سو گئے، پُر ارمان زندگی اور پُر حسرت موت کی داستانِ عبرت چھیڑ دی ہے۔ کہیں "انجامِ گُل"، "سبزۂ نو"، "شمعِ سحر" کے زیرِ عنوان غیر فانی زندگی کا تذکرہ ہے۔ اور کہیں فریادِ یتیم، "شکوۂ بلبل کی فریاد"، "چڑیا کی زاری"، "مچھلی کی بے تابی"، "کولھو کا بیل"، اور اسی قسم کی دوسری نظمیں انسانی ستم و تغافل کے شکار بے زبانوں کے درد و غم کی داستانیں ہیں۔ محروم کی آنکھیں ہر وقت دوسروں کے غم میں آنسو بہاتی ہیں، اُن کا دل ہر دم ہمدردی سے لبریز رہتا ہے، اور اُن کا تخیل اُن کے دُکھ درد کی تصویریں کھینچنے میں وقف ہے۔ کون ہے جو ان نظموں کو پڑھے، اور درد کے احساس سے تڑپ نہ اُٹھے۔ "کولھو کا بیل" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ختم ہونے نہیں پاتا وہ سفر ہے اپنا — ہم چلے جاتے ہیں دن رات جگر ہے اپنا
کاش اس راہ میں آ پڑتا عدم کا رستہ — اُلٹا افسوس نصیبا ہی سکر ہے اپنا
تیل ٹپکے ہے پڑا کولھو سے قطرہ قطرہ — خشک ہوتا ہے اِدھر لوہو سے قطرہ قطرہ
مرغزاروں میں نہ جا کر کبھی سبزہ دیکھا — بہتے دریا کا نہ سرسبز کنارا دیکھا
چار دیواری یہی تیلی کے گھر کی دیکھی — اور اس قیدِ دوامی میں کیا کیا دیکھا

اب یتیم کی فریاد سنیئے ؎

گھن قسمت میں تھا اپنی وگرنہ نور برساتے — کسی کے مطلعِ اُمید پر مثلِ قمر ہم بھی
جگہ دیتا ہے باغِ دہر پھولوں میں نہ کانٹوں میں — اُڑا لے چل تو اپنے ساتھ اے برگِ خزاں ہم کو
وہ لاغر ہیں کہ احساں موت کا بھی اُٹھا نہیں سکتا — عدم کی سمت کوئی لے اُڑا کر دے وہاں ہم کو

بلبل کی فریاد سے ایک آدھ شعر سنئے ؎

اس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے — میرا بھی کچھ تو چارہ پروردگار ہوتا
شاخِ نہال پر یا پنجرہ مرا لٹکتا — پنجرے میں یا ہجوم سرو و چنار ہوتا

انسانی جور و جفا کی داستانیں 'چڑیا کی زاری' اور 'مچھلی کی بیتابی' میں دی گئی ہیں۔ ایک دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

نزدیک نسلِ انساں ہرگز نہ کوئی آئے — اپنے جگر پہ ہرگز تیغِ ستم نہ کھائے
حیرت میں ہوں نہنگِ تشنہ ہے کہ آدمی — جاندار ہیں دانت بلا ہے کہ آدمی

'خوابِ جہانگیر' اور 'نورِ جہاں کا مزار' بھی اپنے رنگ میں خوب نظمیں ہیں۔

جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

منتظر محفلِ عشرت ہے شہا جاگ کہیں ۔۔۔ او صبوحی کشِ مستانہ ادا جاگ کہیں

لیکن "نورجہاں کا مزار" درد و غم کا ایک مرقع ہے، اور سارا پڑھنے کے قابل ہے۔ ذیل کے اشعار میں غضب کا درد بھرا ہے ؎

ایسی کسی جوگن کی بھی کُٹیا نہیں ہوتی ۔۔۔ ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے ۔۔۔ دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

انھوں نے فطرت کی رنگینیوں کی بھی تصویر کھینچی ہے، لیکن اُن میں بھی درد و غم کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ قدرت کا انتہائی نکھار اُن کے فطرتی جذبۂ غم پر تازیانے کا کام کرتا ہے۔ "کنارِ راوی" پڑھیے۔ آپ کو اِس امر کی حقیقت کا علم ہوگا۔

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں؟ ۔۔۔ ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں؟

گلشنِ دہر میں فراغ کہاں؟ ۔۔۔ چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں؟

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

آنکھ کھولی اِدھر ستاروں نے ۔۔۔ جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے

گو اشارے کئے ہزاروں نے ۔۔۔ آنکھ اٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

میکدوں میں چراغ روشن ہیں   نو رمے سے ایاغ روشن ہیں
کہ بکفِ شب چراغ روشن ہیں   یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

رخصتِ سرما میں بھی اسی قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں ؎

مگر آہ جس چمن کا میں ہوں عندلیبِ نالاں   ہوئیں مدتیں کہ اس میں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم رہی تا سحر وہ گریاں   جو صبا کہیں سے آئی تو لیے غبار آئی

جب غم کے ہاتھوں زندگی دوبھر ہو گئی تو عہدِ طفلی کی یاد بے طرح دل کو تڑپاتی ہے۔ بچپن ایک خواب معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حد شیریں اور بے حد مختصر "سندھ کو پیغام" پڑھیے ؎

طفلی وہ مری اور وہ معصوم امنگیں   اے وائے وہ دل خوش کن و موہوم امنگیں
وہ کھیلنا میرا تری امواج سے دن بھر   وہ چھیڑ مری بلبلے کے تاج سے دن بھر
خورشیدِ جہاں تاب کا وہ چھپ کے نکلنا   محروم کا وہ شوق سے بستر سے اچھلنا
نورانی دوپٹے میں کرن کا وہ نکھرنا   سونا زرسے اس کا وہ عروسانہ سنورنا

ایبٹ آباد

مطبوعہ "زمانہ" کانپور

جون ۱۹۳۸ء

تلوک چند محروم

ہر بھگوان پرشاد

نام تلوک چند تخلص محروم، وطن مالوف عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی، صوبہ پنجاب ہے۔ جولائی ۱۸۸۷ء میں آپ نے عالم ارواح سے عالم اجسام کا رخ کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ ڈیرہ اسمٰعیل خاں، عیسیٰ خیل اور کلور کوٹ میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ملازمت سے آپ ریٹائر ہو گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے لے لئے گئے اور ہنوز آپ یہیں کام کر رہے ہیں۔ ایف اے اور بی اے وغیرہ کے امتحانات آپ نے اسکولوں کی ملازمت کے دوران میں پاس کئے تھے۔

محروم صاحب قدرت سے ایک شاعرانہ طبیعت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کے سینے میں حساس اور دردمند دل ہے۔ تیسری جماعت سے آپنے شاعری شروع کر دی تھی۔ ذرا غور فرمایئے، جس بچے نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا ہو، جو ابھی بخوبی باتیں بھی نہ کر سکتا ہو، وہ اگر اچھے اچھے شعر کہنے لگ جائے تو اس کا مستقبل شاعری کتنا شاندار اور ہنگامہ خیز ہوگا۔ محروم صاحب کے متعلق یہ معلوم کر کے اور بھی حیرت ہوئی ہے کہ انھوں نے شعر وسخن میں بے طرح مستغرق ہونے کے باوجود اپنے تعلیمی مشاغل میں کبھی خلل پیدا نہیں ہونے دیا، بلکہ آپ نے تمام امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے، اور اکثر امتحانات میں آپ نے وظائف و انعامات حاصل کیے۔

زمانۂ طالب علمی میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر آپ نے ایک دردناک مرثیہ کہا، جسے حکام محکمۂ تعلیم اور اسکول کے مدرسین نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، اور ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم نے اپنی خوشنودی کا اظہار بذریعہ تحریر کیا۔ اس نوحے کا ایک شعر یہ تھا۔

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں، گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

آپ نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ اپنی طبیعت ہی کو اپنا رہبر سمجھا۔ نویں جماعت سے آپ کے نتائج افکار ملک کے مشہور و معروف ادبی

رسائل میں چھپنے شروع ہو گئے۔ جن میں سے زمانہ کان پور اور مخزن لاہور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں دنوں آپ نے ایک نظم "بلبلہ" لکھی۔ جسے تمام ہندوستان میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج کل یہ نظم نصاب تعلیم پنجاب کے اعلیٰ کورسوں میں شامل ہے۔ نو مشقی کے عالم ہی میں آپ کو وقتاً فوقتاً سرور جہان آبادی، بشیر الدین احمد خاں، اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال سے دادِ سخن ملا کرتی تھی۔ شاعری میں آپ استادی شاگردی کے قائل نہیں۔ آپ کا قول ہے کہ فطری رجحان اور اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ ہی سب سے بڑا استاد ہے۔

آپ کی اخلاقی، ادبی اور نیچرل نظموں کا پہلا مجموعہ "کلام محروم" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ کتابیں اپنے وقت میں بہت مقبول ہوئیں، اور آج کل تینوں نایاب ہیں۔ دوسرے مجموعے کا نام "گنجِ معانی" ہے۔ جسے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۳۲ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ اسے بھی ملک کے طول و عرض میں غیر معمولی قدر و منزلت نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ "نیرنگِ معانی" "رباعیاتِ محروم" "شعلۂ نوا" "کاروانِ وطن" اور "بہارِ طفلی" کے نام سے محروم صاحب کے کلام کے مختلف مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعے بہت جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آجائیں گے۔

جناب محروم نہایت بااخلاق اور سنجیدہ مزاج ہستی ہیں۔ ہر ملنے والے

کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی اور مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بے فکری پر رشک کرتے ہیں۔ اساتذۂ سلف سے آپ کو حد درجہ خلوص و عقیدت ہے۔ آپ کو مناظرِ قدرت سے والہانہ دلبستگی ہے۔ بیابان، لبِ جو اور باغ وغیرہ آپ کی دل پسند سیر گاہیں ہیں۔ آپ نے بے شمار مشاعروں میں اپنا کلام سنایا، سینکڑوں ادبی مجالس کی صدارت کی۔ اب بھی آل انڈیا ریڈیو پشاور سے آپ کی ادبی تقاریر نشر ہوتی ہیں۔ اور ریڈیائی مشاعروں میں بھی آپ اکثر حصّہ لیتے ہیں۔

اوائل ہی سے محروم صاحب نے غزلوں کی طرف بہت کم توجہ دی ہے، مگر اس کے باوجود اُن کی غزلوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ نظم چھوڑ کر صرف اسی صنف میں طبع آزمائی کرتے رہتے تو آج غزل گوئی کے میدان میں شاید ہی کوئی شخص ان کا ہم سر ہوتا۔ میرے اس دعوے کی تصدیق کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمایئے گا ؎

سرورِ عاشقی بعدِ فنا بھی مونسِ جاں ہے	کہ صحرا کے بگولوں میں غبارِ قیسِ رقصاں ہے
خیالِ رنج و راحت میں عبث اے دل پریشاں ہے	نہ یہ قایم نہ وہ دایم یہ پرّاں وہ شتاباں ہے
چراغِ زندگی روشن سرِ راہِ بیاباں ہے	ہوائے دہر کا ہر ایک جھونکا دشمنِ جاں ہے

تینوں مطلعے شاعری کی جان ہیں۔ ع

سرورِ عاشقی بعدِ فنا بھی مونسِ جاں ہے

ماشاء اللہ کتنا پیارا مصرعہ ہے۔ ایک عاشقِ صادق کی دلی کیفیت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور پھر اس کیفیت کو اور بھی نمایاں طور پر ظاہر کرنے کے لئے کتنی نادر تشبیہہ تلاش کی گئی ہے۔ دوسرے مصرعے کے شروع میں کاف بیانیہ کی نشست قابلِ داد ہے۔ اس حرف نے دونوں مصرعوں کو دست و گریباں کر دیا ہے۔

دوسرا مطلع ان لوگوں کے لئے مایۂ تسکین ہے جو ہر وقت رنج و راحت کے فضول خیالوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ راحت کو تمام دنیا فانی مانتی ہے۔ مگر رنج کی ناپائیداری پر بہت کم لوگوں کی نگاہ پڑی ہے۔

تیسرے مطلع میں انسان کی زندگی کو ایک چراغ قرار دیا ہے۔ وہ چراغ بیابان کے راستے پر جل رہا ہے، اور وہاں کا ہر جھونکا اس کے لئے موت کا پیغام ہے۔ زندگی اور چراغ کی تشبیہہ قریباً تمام استادوں کے کلام میں موجود ہے۔ مگر محروم صاحب نے اُسے جس ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے اُس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر ان کے نام کو تا قیامت زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

یہ آج سے بائیس سال پہلے کا کلام ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اگر محروم صاحب اس وقت سے غزل کہتے رہتے تو غزل گوئی میں اُن کا مرتبۂ سخن کس بلندی پر پہنچ چکا ہوتا لیکن یہ افسوسناک بات ہے کہ غزل کو قریباً قریباً خیرباد کہہ کر عرف

نظم ہی کو انھوں نے اپنا موضوعِ سخن بنا لیا ہے۔ لیکن ہماری شکایت اُس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام نظمیں تغزل ہی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جا بجا وہی عاشقانہ تشبیہات اور مضامین نظر آتے ہیں پھیکی سے پھیکی بات کو بھی نہایت رنگینی سے ادا کیا ہے۔ مثلاً شراب کی مذمت میں کہتے ہیں ؎

فریبِ دہر نے تدبیرِ جاں ستانی کی
کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی

محروم صاحب کے کلام میں سوز و گداز کی فراوانی ہے، اور یہ خصوصیت آپ کو ہندوستان بھر کے شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔ غم و الم کے جذبات کی ترجمانی میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

چنانچہ آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ اور کم سن بچی کی وفات پر جو نوحے لکھے ہیں اُنھیں پڑھ کر کوئی بھی آنسوؤں کو نہیں روک سکتا۔ اس کے علاوہ شعرائے ہمعصر اور مشاہیرِ وطن کے ماتم میں انھوں نے نوکِ قلم سے خونِ جگر ٹپکا دیا ہے۔

حضرات سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، نادر کاکوروی، مولانا گرامی، آغا حشر، برق دہلوی، علامہ اقبال، طالب بنارسی، سحر ہنگامی، منشی دیا نرائن نگم اور رابندر ناتھ ٹیگور، کے مرثیے جن میں سے اکثر اُن کے مجموعۂ کلام "گنجِ معانی" میں آچکے ہیں، ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں۔ لالہ لاجپت رائے

اور سی، آر، داس کی وفات پر نہایت پُر درد مرثیے لکھے ہیں، جن میں جذباتِ حُبّ وطن کا طوفان متلاطم نظر آتا ہے۔ ان نوحوں کا اقتباس ہمارے مضمون کو بہت طولانی کر دے گا۔ اس لئے ہم صرف چند شعر اس دردناک نوحے سے نقل کرتے ہیں جو اُنھوں نے اپنی دو برس کی بچّی کی موت پر لکھا تھا، اور اُن کے کسی مجموعۂ کلام میں شائع نہیں ہوا۔

مزار پر دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے، پھر آج آ گئے
اے کاش! زیرِ خاک سے ہو آشکار تُو

ہم دودھ لے کے آئے ہیں گھر سے ترے لئے
دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیر خوار تُو

گھر میں تو رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ
آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تُو

افسوس! عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات
جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بے قرار تُو

جانے سے تیرے رونقِ کاشانہ لُٹ گئی
تھی اے شگفتہ لالہ! مرے گھر کی بہار تُو

کیا خوشگوار چلتی ہے بادِ نسیمِ صبح
اور زیرِ سنگ خاک ہے وقفِ فشار تُو

برسا رہے ہیں اشک کا مینہ تیری خاک پہ
ظاہر ہو تا بہ شکلِ گُلِ نو بہار تُو

روتا ہی پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج
وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تُو

جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب
اُتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

شاعری میں آپ پنڈت برج نارائن چکبست لکھنوی اور منشی درگا سہائے

سرور جہان آبادی کے مقلد نظر آتے ہیں، اور ان کا رنگِ سخن قبول کرنے میں آپ نے کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے دم سے چکبست اور سرور کی یاد تازہ ہے۔ اگر آج یہ بزرگ دنیا میں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ اُن کے لگائے ہوئے باغ کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے پنجاب کے ایک مالی نے کتنی جانکاہی اور تندہی سے کام لیا ہے۔

"زمزمۂ توحید" کے عنوان سے محروم صاحب کی ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

عالم ہے نگار خانہ تجھ سے	اے مایۂ خوبیِ حسیناں
تیرے ہی ولولے ہیں دل میں	اے ذوقِ دلِ جمال بیناں
ہیں صبر و قرار تجھ سے قائم	اے مرہمِ زخمِ غم قریناں
او وجہِ تسلّیِ دلِ زار	او موجبِ راحتِ حزیناں

پروانے کو تیری ہی لگن ہے
اور شمع میں تیری ہی جلن ہے

پہلے شعر میں نگار خانے کے لفظ پر غور کیجئے۔ دنیا میں حُسنِ قدرت کی فراوانی کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے اچھی تشبیہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ دوسرا شعر جذبات نگاری کا مرقع ہے۔ "ہی" کے لفظ میں گویا جادو بھرا ہوا ہے۔ عشق و محبت کے جذبات کو ولولے کا نام دینا محروم صاحب ہی کا حصّہ ہے۔ تیسرے

شعر میں خدا کو غم قرینوں کے زخم کا مرہم بیان کیا گیا ہے۔ واقعی خدا کی ذات ایک ایسی ذات ہے جو مصیبت میں کام آتی ہے۔ چوتھے شعر میں کوئی نئی بات موجود نہیں، مگر اس کے باوجود یہ شعر اتنا دردناک اور رقت انگیز ہے کہ پڑھتے ہی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں "او" حرفِ ندا کا استعمال فنِ بلاغت کا بے مثال نمونہ ہے۔ واضح ہو کہ یہاں 'او' کی جگہ 'اے' بھی کہا جا سکتا تھا، مگر 'اے' میں وہ بات کہاں جو 'او' میں ہے۔ اس 'او' نے تمام شعر کو آنسوؤں میں ڈبو دیا ہے۔ پانچویں شعر میں ارشاد ہوتا ہے کہ پروانے کو تیری ہی لگن ہے، یعنی اسے معلوم ہے کہ شمع میں تیری ہی روشنی ہے، اور اسی لئے وہ اس پر قربان ہو جاتا ہے۔ اور شمع کی روشنی بھی تیری محبت کی آگ کے سوا کوئی دوسری شے نہیں۔ سبحان اللہ کتنی نازک خیالی ہے۔ ایک ہی چیز کو نورِ الٰہی اور آتشِ عشق سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اگر صفائی اور بے تکلفیٔ بیان کی مثال دیکھنی ہو تو مذکورہ بالا نظم کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے گا۔

یہ کشمکشِ حیات کیا ہے	تیرا ہو کرم تو بات کیا ہے
اے رہبرِ کاروانِ ہستی	راہِ غمِ مشکلات کیا ہے
تو جس کو دکھا دے اک تجلی	کیا جانے وہ غم کی رات کیا ہے

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ مخدوم صاحب نے یہ نظم دسویں جماعت میں کہی تھی۔ جہاتما بدھ سکونِ ابدی کی تلاش میں ایوانِ شاہی سے رخصت ہو رہے

ہیں۔ آدھی رات کا وقت ہے۔ آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں، وہ اُن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

اے ستارو! تم سراپا ہو کے چشمِ انتظار — دیکھتے ہو میری جانب صورتِ امیدوار
لو اب آیا ہیں اب آیا تم یہ ہونے کو نثار — کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار
آہ میں جکڑا ہوا سونے کی زنجیروں میں ہوں — ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

ایسے وقت میں مہاتما بدھ کا ستاروں سے خطاب کرنا محض شاعرانہ تخیل نہیں، بلکہ واقعی ایسا ہوا ہوگا۔ ہر وہ شخص جو عشقِ الٰہی کا لذّت چشیدہ ہو یا اس کا متمنّی ہو، اُسے مناظرِ قدرت سے حد درجہ محبّت ہوگی۔ یہ ایک اصولی بات ہے ع

کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بے قرار

عام طور پر آوارگی کا لفظ مذمت کے معنوں میں آتا ہے۔ یعنی بے کار ہو کر مارے مارے پھرنا۔ مگر یہاں اس لفظ میں کتنی روحانیت اور پاکیزگی بھری ہوئی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنھیں اس آوارگی کی آرزو بے قرار رکھتی ہے۔ دنیاوی تعلقات کو سونے کی زنجیروں سے تشبیہ دینا ندرت کی انتہا ہے۔

آخر میں جناب محروم کے کلام کا مختصر انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے، پڑھیے اور لطف اُٹھایئے ؎

ہر ستارے کی چمک ہے حق نما میرے لیے — ہو گیا رہبر فریبِ ماسوا میرے لیے
لا نہیں سکتا ہوں میں صدماتِ ناکامی کی تاب — چاہیے دل بے نیازِ مدعا میرے لیے

یاد جب بھی آ گئی تیری نگاہِ اوّلیں! کھُل گیا اک دفترِ مہر و وفا میرے لئے

اب تو اے محرم اک اُجڑی ہوئی محفل ہے دہر وہ بھی دن ہے جب یہ بزم ہاں تھا میرے لئے

(غزل)

جوانی اور بُوئے گُل میں یا رب کیا تعلق تھا
کہ بُوئے گُل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

(غزل)

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے جو پیکرِ ہستی کے لئے رُوحِ رواں تھے

محبوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجرے پڑے زیرِ زمیں ہیں

(نور جہاں کا مزار)

ہر ایک گُل سے شرر طُور ہے تجلّوہ گری کہاں ہی آہ! مجھے تابِ جلوہ ہائے بہار

ہجومِ گُل سے زمیں پر جگہ نہیں باقی شفق کے پھول فلک پر نہ کیوں کھلائے بہار

(نوائے بہار)

جانبِ مشرق گئی جب صبح دم خالی نظر واژگوں اک کاسۂ حسرت نظر آیا آفتاب

دفعتہً مستانہ میں نے اس پر اک ڈالی نظر جامِ زرّیں میں چھلکتی تھی محبت کی شراب

(محبت کے کرشمے)

وہ گرد کا پہاڑ اُٹھا پھر شمال سے بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت ہیں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے

روپوش اس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہوا

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا اپھنکارتی للکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی
ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم اُبھارتی اُڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی
ہل چل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی

(آندھی)

"آج کل" دہلی
جون ۱۹۴۶ء

گنجِ معانی

وقار انبالوی

منشی تلوک چند محروم کے کلام فصاحت التیام کا مجموعہ جن کی شاعری بیسویں صدی کے شروع (شاید اس سے بھی قبل) سے اب تک یکساں طور پر مقبول و مشہور ہے 'گنجِ معانی' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ محروم نے سب سے پہلے شعر کب کہا لیکن کلام کی یکسانیت اور ہمواری زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ محروم کا نقش اول آخر سے دھندلا نہیں، اور یہ دلیل ہے اس امر کی کہ محروم پیدائشی شاعر ہے۔

محروم کی مادری زبان ڈیرہ والی پنجابی ہے۔ لیکن وہ اُردو کا شاعر ہے۔ فارسی میں بھی شعر کہتا ہے۔ زبان کے اکتسابی ہونے میں تو کچھ شک ہی نہیں۔

لیکن اس کی شاعری قطعاً وہبی ہے۔ پھر خیال کے علاوہ محروم کے ہاں الفاظ کا ذخیرہ اتنا ہے کہ اگر اس کے حالات سے واقفیت نہ ہو تو اسے پنجابی کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

'گنجِ معانی' کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ محروم کس قسم کا شاعر ہے۔ اس نے اپنے لئے دنیائے شعر میں کون سی جگہ پسند کی؟ حالات اور حادثات نے اس کی شاعری کا رُخ کس طرف موڑا؟

محروم کی شاعری باعتبارِ مضمون چار حصّوں پر تقسیم کی جا سکتی ہے —

مذہبیات — نصائح — مناظر — مراثی۔

جہاں تک مذہبی نظموں کا تعلق ہے، محروم کے کلام میں یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ وہ مذہب کو کسی قوم اور ملک کی جاگیر نہیں سمجھتا۔ اس معاملے میں اس کے خیالات عالم گیر ہیں، اور احساس نہایت لطیف اور پاکیزہ۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ محروم نے بجائے کسی نفشنل اسکول کے مسجد میں بغدادی قاعدے سے اپنی تعلیم شروع کی۔ محروم کی ان نظموں میں جو خدا اور بندے[1] کے تعلقات پر کہی گئی ہیں، پُرانی ڈگر پر چلنے والوں کی تصویریں نہایت واضح ہیں۔ جو نظمیں نصائح کے طور پر کہی گئی ہیں ان میں اخوّت، مساوات، رواداری پر اور قومیت و وطنیت کی جگہ انسانیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مناظر نگاری کرتے وقت

---

[1] اور پھر ڈیرہ دال —؟

ہر چند کہ محروم اپنے محسوسات بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن نصیح ورثی کی جھلک ان نظموں میں بھی موجود ہے۔ جن نظموں کو ہم مذہبیات کے تحت لاسکتے ہیں اُن میں کچھ نظمیں تو خدا اور انسان کے تعلقات پر ہیں، کچھ مذہبی تاریخ کے سین ہیں۔ ان کا انتخاب درج ہے ؎

تاروں میں چمک دمک تری ہے — جو رعد میں ہے کڑک تری ہے
اے باعثِ رونقِ گلستاں — شاخوں میں لہک چہک سی ہے
ہر غنچے میں ہے ترا تبسّم — ہر گل میں بھری مہک تری ہے
نغمے مرغانِ خوش گلو کے — کہتے ہیں یہ سب چہک تری ہے

مہ و مہر کی جلوہ سامانیوں میں — طیورِ سحر کی نوا خوانیوں میں
فضائے چمن کی گل افشانیوں میں — ہواؤں میں خشکی میں اور پانیوں میں
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے

نہیں گو بہ قیدِ مکان و زماں تُو — زمیں پر فضا میں، سرِ آسماں تُو
کہوں کیا کہاں ہے نہیں ہے کہاں تُو — نہاں تُو، عیاں تُو، یہاں تُو وہاں تُو
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے

"خطا کس کی ہے" یہ نظم نہیں ایک استفہام طنزیہ ہے، اور ایک فہمائش تسکین۔ دیکھئے ؎

آبشاروں کا ترنّم ترے بہلانے کو ۔۔۔ لالہ زاروں کا تبسّم ترے بہلانے کو

دن کو ہنگامۂ مردم ترے بہلانے کو ۔۔۔ رات کو محفلِ انجم ترے بہلانے کو

مجھ کو دی تابِ تکلّم ترے بہلانے کو!

اب بھی شاداں نہ ہوا ے دل تو خطا کس کی ہے؟

بابر اور نانک کی شراب کا مقابلہ کس خوبی سے کیا ہے۔ گورونانک دیو جی اُس شراب کے شرابی تھے جس کا نشہ یقیناً دائمی ہے اور جس میں اندیشۂ خمار نہیں، اس لئے محروم کو یہ موضوع بھا گیا۔ بابر کی شراب شاعر محروم کی نظر سے، اور نانک کی شراب صوفی محروم کی نظر سے بیان کی ہے۔

بابر

جہاں میں آبِ رز سے کونسا ہے پاک تر پانی ۔۔۔ کہ دُھل جاتا ہے جس سے دفترِ ما وشما بابا

نہ میخانے کو دیکھا چاہیئے چشمِ حقارت سے ۔۔۔ کہ ہوتی ہے یہیں سے بیخودی کی ابتدا بابا

نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دنیا بزمِ ماتم ہے ۔۔۔ ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا بابا

آخری شعر پڑھ کر ایک فارسی کا شعر یاد آ گیا ؎

چیست میدانی مئے گلگوں مصفّا جوہرے

حُسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

گورونانک دیو

وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے جام ساغر ہیں ۔۔۔ جو صہبائے مروّت سے سدا بھرپور رہتے ہیں

ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے　　اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں

لنڈھائے ہوں جھنوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں کے　　کہاں وہ طالبِ افشردۂ انگور رہتے ہیں

اسی خیال کے سلسلے میں جو مذہبیات کا مظہر ہے، رامائن کے چند سین بھی ہیں، حسنِ احساس کے ساتھ جب حسنِ عقیدت بھی ہو تو پھر کیا کہنے ہیں اثر کے۔ "غزمِ سفر" ایک آنسو ہے گرم گرم، جو محروم کے دل سے اُٹھا اور آنکھوں کی راہ بہہ گیا۔ "ویران کٹیا" نقشہ ہے اُس ایثار و محبت کا جو قدرت نے سیتا، رام، لچھمن کو دے کر پھر کسی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

"سیتا کی فریاد" کا ایک شعر دیکھئے کس قیامت کا ہے ؎

رام کی خاطر زمانے بھر کو چھوڑا تھا، مگر

آہ! مجھ کو رام نے چھوڑا زمانے کے لئے

ہندوستانی عورت کی عصمت کا جلال دیکھنا ہو تو "اعجازِ عصمت" ضرور پڑھئے۔

محروم کی وہ شاعری جو مناظر و محسوسات پر مبنی ہے بہت وجد آفریں اور دل نواز ہے۔ اس باب کے لئے مفصّل تنقید درکار ہے۔ افسوس ہے کہ قلتِ صفحات کی وجہ سے میں جی کھول کر محروم کی داد نہیں دے سکتا، انتخاب درج کرتا ہوں ؎

عشرت ہے صلائے عامِ نوروز　　خورشید سحر ہے جامِ نوروز

لائے نے اُٹھا لیا پیالہ ... بھر مئے لعل فامِ نوروز

"بدھ کی ایوانِ شاہی میں آخری رات" محروم کی غم پسند طبیعت کی تلاش دیکھئے۔ وہ موقع تلاش کیا ہے جہاں زندگی کی عشرتیں اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے باوجود ہیچ نظر آتی ہیں۔ بدھ کس شانِ استقلال سے کہتا ہے

عشرتِ ایامِ آغازِ جوانی الوداع! ... الوداع اے ذوق و شوقِ عیشِ فانی الوداع

الوداع اے تاج و تخت و مرزبانی الوداع ... الفراق اے خرمی، اے شادمانی الوداع

الوداع اے حسرتِ لیل و نہارِ آرزو!

اے دلِ غمدیدہ بن جا تو مزارِ آرزو

اے فریبِ الفتِ فانی نہ تو بہکا مجھے ... آہ اے جھوٹی محبت دے نہ اب دھوکا مجھے

دیدنی ہے روئے گُل، پر اس سے مطلب کیا مجھے ... گھر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے

یہ کشاکش ہائے بیجا ہیں سلاسل کی طرح

توڑ دوں ان کو طلسمِ نقشِ باطل کی طرح

سرور سے ایک خطابیہ نظم بس پڑھنے کے قابل ہے۔ آخری شعر سے نظم کا انداز کر لیجئے ؎

جی میں آتا ہے کہ آ کر چوم لوں تیرے قدم

آہ لیکن جانگزا ہے دوریِ منزل کا غم

ہم عصروں سے یہ عقیدت، اردو زبان کی ساری تاریخ میں عدیم النظیر ہے۔

محروم اور سرور میں زیادہ فرق نہیں۔ لیکن اعترافِ کمال صاحبِ کمال ہی کر سکتے ہیں، اور پھر اس کا اظہار؟ یہ قدرت نے محروم کے لئے اٹھا رکھا تھا۔

ایک نظم میں محروم دل سے باتیں کرتا ہے ؎

نہ شگفتہ فصلِ گل میں — نہ کسی چمن میں خنداں
نہ قرار شور وغل میں — نہ سکوت میں ہے شاداں
تجھے کیا ہوا ہے ناداں

موت پر ایک نظم ہے۔ غالب ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب موت پر نہیں فلسفۂ موت پر نظر رکھتا ہے۔ محروم اس عنوان کے ماتحت جذبات سے کھیلتا ہے ؎

تو جس کا بچہ لے گئی اُس ماں کا حال دیکھ — جاری ہیں اشک گرچہ ہوئے ماہ و سال دیکھ
اے موت دیکھ طولِ زمانِ ملال دیکھ — اب تک اَٹے ہیں راکھ میں سب سر کے بال دیکھ
ایسی بھی غمزدوں کی کہیں ہے مثال دیکھ — ہر وقت روتے دھونے سے آنکھیں ہیں لال دیکھ

نورِ نظر کے غم میں یہ اتنا جو روئے گی
آنکھیں تو خیر جان کو اک روز کھوئے گی

”موت کا موسم“ اسی قبیل کی ایک اور نظم ہے۔ ”بوئے گل“ محروم کی

قادر الکلامی کی تصویر ہے ؎

ترے نفس سے ہوا مایہ دارِ ہستی ہے — یہ فصلِ گُل ہے کہ دورانِ مے پرستی ہے

مئے سرور شکیتی ہے جام سے تیرے — ہے سب کو بہرہ وری فیضِ عام سے تیرے

غضب کی اُف تری لپٹوں میں ہے فسوں کاری

دل و دماغ پہ اک بیخودی سی ہے طاری

مخدوم "بُوئے گُل" سے سبق لیتا ہے ؎

اُجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تو نے — سبق زمانے کو ایثار کا دیا تو نے

"انجامِ گُل" مخدوم کی نظم مجھے بے حد پسند ہے۔ آخری بند کے کچھ شعر تو اُردو میں نایاب ہیں۔ تضاد کا نبھاؤ، نشست میں ترصیع، پھر قافیے کے ساتھ انجام کا مترنم اور غنا آمیز صوتی تکرار۔ واہ سبحان اللہ۔

آغاز طلوعِ صبحِ انور — انجام سوادِ آمدِ شام

آغاز نگاہِ لطفِ ساقی — انجام شکستِ شیشہ و جام

آغاز ہوائے شوقِ پرواز — انجام فریبِ دانہ و دام

آغاز وہ ہے کہ ہائے آغاز — انجام وہ ہے کہ وائے انجام

"شمعِ سحر" میں مخدوم، انیس کا ہمزبان ہے ؎

حسرت برس رہی ہے رُخِ رشکِ ماہ پر — حیرت نثار ہوتی ہے اک اک نگاہ پر

لہ واہ وا ؏ اُڑتی ہے شراب پھول بن کر

بجلی گرائی صبح کی ایک بے گناہ پر　　ہے داغِ تازہ دامنِ چرخِ سیاہ پر

تاراج ہو گیا چمنِ حسن و عشق حیف

برہم ہوئی وہ انجمنِ حسن و عشق حیف

پروانے جن کی خاک سے ظاہر ہے شانِ عشق　　مضطر تھے کب سے آہ پئے امتحانِ عشق

گر شوق ہو تو کیجئے سیرِ جہانِ عشق　　کیا کیا ہیں یہ مزار و کفن کشتگانِ عشق

بڑھ کر ہے "اگنی بان" سے بھی عشق کا خدنگ!

کشتوں کے پشتے لگ گئے بے تیر بے تفنگ

رزمیہ میں "اگنی بان" محروم ہی کا حصہ ہے۔ یہ بات انیس کو بھی نصیب نہیں ہوئی،

افسوس کہ اس نظم میں دو ایک جگہ تعقید بری طرح آئی ہے۔

آخری بند ہے ؎

کشتیِ عمرِ شمع پہ آفت بپا ہوئی　　بادِ نسیمِ صبح، مخالف ہوا ہوئی

بے چاری جلد نذرِ محیطِ فنا ہوئی　　اک شب کی زندگی جو ہوئی بھی تو کیا ہوئی

محروم حالِ شمعِ سحر غیر ہو گیا

ہوتے ہی صبح خاتمہ بالخیر ہو گیا

حیاتِ انسانی کی ایک دردانگیز تصویر ہے "یتیم"! اُسے سامنے رکھ کر

محروم یتیم کی ترجمانی کرتا ہے ؎

کسی کی چشمِ الفت[1] کے رہے نورِ نظر ہم بھی　　کسی خستہ جگر کے آہ تھے لختِ جگر ہم بھی

---

[1] اس تصرف پر معذرت!

ریاضِ دہر میں حاصل ہوئے ہم بھی ریاضت سے
بنے آخر کسی کی شاخِ ارماں کے ثمر ہم بھی

نہیں تھا اپنی قسمت میں نہیں یا تو نور برساتے
کسی کے مطلعِ اُمیّد پہ مثلِ قمر ہم بھی

مقدر میں تھا تاراجِ خزاں ہونا یونہی ورنہ
شگفتہ آج ہوتے صورتِ گلہائے تر ہم بھی

آہ کیا حسرت بھرے الفاظ ہیں ؎

رکھے گی آہ قسمت کب تلک بے آب و نان ہم کو
گذارہ کرنا ہوگا کھا کے کب تک جھڑکیاں ہم کو

جگہ دیتا ہے باغِ دہر پھولوں میں نہ کانٹوں میں
اُڑا لے چل تو اپنے ساتھ اے برگِ خزاں ہم کو

خدا وہ دن دکھائے جب نظر ہم اس کو آ جائیں
سنا ہے ڈھونڈتی پھرتی ہے مرگِ ناگہاں ہم کو

فنی نقطۂ نظر سے یہ نظم محروم کی شان سے کچھ گری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی
ایک وجہ یہ بھی ہے کہ محسوسات کی شدّت جذبات میں وہ تلاطم پیدا کر دیتی ہے کہ طبیعت
پر ہر قید بار معلوم ہوتی ہے۔ یوں بھی۔ ع

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے!

لیکن یہ دیکھنے کی بجائے کہ محروم کس طرح کہہ گیا ہے۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ محروم
کیا کہہ گیا ہے "کولھو کے بیل" کا آخری شعر اپنی سادگی کی وجہ سے بظاہر مضحکہ خیز سا
ہے لیکن جن احساسات پر اس شعر کی بنیاد ہے۔ کوئی اُن کی تلاش کرے تو یہ
شعر درد و کرب کی المناک دنیا نظر آئے ؎

اے خدا ملکِ عدم میں نہ ہو کولھو کوئی
ہم کو مل جائے نہ پھر آہ جفا جُو کوئی

اس شعر کے تاثرات میرے دل میں تو تا حیات چٹکیاں لیتے رہیں گے۔

"موہنی" ایک استعارۂ لطیف ہے، جسے اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہندو علم الاصنام کی لطیف تریں روایات اگر اسی طرح نظم ہوتی رہیں تو اردو نظم کا دامن جمالیات سے مالامال ہو جائے۔

"اپنا گھر" میں ہم گھر باری آدمیوں کے دل کی بات محروم نے کہی ہے۔ آخری بند کتنا مزیدار ہے۔

بستا ہوا گھر رحمتِ باری کا نشاں ہے   افلاک سے ہر دم برکت جلوہ کناں ہے
نکہت گلِ الفت کی وہاں عطر فشاں ہے   ہے گلشنِ شاداب کہ بے نقصِ خزاں ہے

یارب رہے آباد زمانے میں گھر اپنا
ناکام زمانہ ہو مٹانے میں گھر اپنا

آہ! گھر کو اس نظر سے دیکھنے والے کا گھر برباد ہوا، اور اس طرح کہ محروم کی عمرِ عزیز کا ایک حصّہ اس کی نوحہ خوانی میں صرف ہو گیا۔ خدا اب محروم کے حق میں آخری شعر کو قبول کئے رکھے۔

"بچّہ" ایک عجیب فلسفیانہ نظم ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے۔ محروم اس سے پوچھتا ہے ؎

کونسی دنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟   رونے والے یاد کس کس کی رُلاتی ہے تجھے؟
کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تو؟   گلشنِ فردوس سے منہ موڑ کر آیا ہے تو؟

اس نظم کے آخر میں کیا پتے کی بات کہہ گیا ہے ؎

اِس قدر مانوس ہو جائے گا اس دُنیا سے تُو | پھر وطن کی یاد ہوگی اور نہ اُس کی آرزو

آہ ! دنیا !!

"صحرا" سے مخاطب ہے ؎

تو ٹھکانا غم کے ماروں کے لئے | امن کا گھر بے قراروں کے لئے
دل کی راحت دل فگاروں کے لئے | الغرض ایسے ہزاروں کے لئے

دہر میں اک بے بدل ماوا ہے تُو
جنّت الماوئ ہے یا صحرا ہے تُو

"آندھی" کے ہر شعر سے ایک طوفانِ معنی اُٹھتا نظر آتا ہے ؎

وہ گرد کا پہاڑ اُٹھا پھر شمال سے | بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے | آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے

روپوش اس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہوا

اللہ اللہ کیا آمد ہے ؎

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھنکارتی ! | للکارتی زمیں کو فلک کو پکارتی
ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم اُبھارتی ! | اُڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اُتارتی
یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی | ہلچل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی

اس نظم کے پہلے بند کی ٹیپ مقامی ہے۔ میرے ناقص خیال میں نظم کی پیشانی

پر یہ داغ ہے۔

"بلبلے" پر تو دو شعر محروم لاجواب کہہ گیا ہے ؎

کتنا اُبھار، کتنی اکڑ، کیسی شان ہے — پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

کس نازنیں کی بزم کا یا رب یہ جام ہے — سارے جہاں کی نازکی جس پر تمام ہے

"کنارِ راوی" تاثرات کا ایک دریا ہے۔ ٹیپ سے اندازہ کریجیے کہ

اس کی ترجیع میں محروم کیا کچھ نہ کہہ گیا ہوگا ؎

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

گنگا کی تعریف میں یہ بند کتنا وجد انگیز ہے ؎

نورِ سیال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تُو — حیرت افروزِ دل و دیدۂ حیراں ہے تُو

کس دل آویزی و تیزی سے خراماں ہے تُو — مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تُو

حسن بیتاب! نمائش سے پشیماں کیوں ہے؟

پردۂ رُخ ترا جلوہ ہے، گریزاں کیوں ہے؟

"ہلالِ عید" میں معصومیت اور شوخی کا جو عنصر محروم جیسے "قنوطی" شاعر نے

داخل کر دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ نظم محروم نے کہی ہوگی۔

جب اس نظم کو محروم کی مان لیا جائے تو محروم کو ماننا پڑتا ہے۔

"بندرابن کی صبح" محروم کی خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ اس کے مقطع میں قافیے کی غلطی ہے۔ اُردو میں واوِ مجہول جب کہ حرفِ ماقبل پر فتح بھی ہو، کسی طرح واوِ معروف کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔ خیر!

"صبح کے ستارے" سے دو شعر نقل کرتا ہوں ؎

اس طرح آتے ہیں نظر بے نور جیسے دھندلا کوئی چراغ ہو دُور
یا ہوں جیسے فسردہ اور ملول آخری موسمِ بہار کے پھُول

"شام" کا ایک شعر ہے ؎

سایۂ کوہِ سرفراز بڑھا صورتِ گیسوئے دراز بڑھا

"شفق شام" میں کہتا ہے ؎

یا اُڑا رہا ہے چرخِ شعبدہ کار باغہائے زمیں سے رنگِ بہار

فصلِ خزاں، رخصتِ مہرباں، اس کے بعد چند بہاریہ نظمیں کچھ بسنت پر نظمیں محروم کی شاعرانہ تخیل کی آئینہ دار ہیں۔ افسوس کہ "چندان" کی تنگ دامانی تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔

ان نظموں میں سے ایک نظم بالخصوص قابلِ ذکر ہے جس کا عنوان ہے "ایک آرزو" سب سے پہلے غالب نے ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

کہہ کر ادو نظم میں غالباً پہلی دفعہ اپنی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد اقبال نے

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب　　کیا لطف زندگی کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

کہہ کر اپنی آرزو کا ایک مسلسل نظم میں اظہار کیا۔ محروم نے شاید اقبال کی ہم نوائی کی ہے۔ لیکن جو کچھ اس میں محروم نے کہا ہے وہ شاید محروم ہی کہہ سکتا تھا۔

آہ دنیا کے یہ جھگڑے اور یہ فکرِ بیش و کم　　بیقراری ہائے امیدِ مسرت، خوفِ غم
ہر قدم پر راہِ نیرنگِ جہاں کا سامنا　　شعبدہ آرائی ہائے آسماں کا سامنا
ہے کہیں جور و جفا مہر و وفا کے رُوپ میں　　اور کہیں مکر و دغا صدق و صفا کے رُوپ میں
شعلہ ہائے آتشیں کین و حسد کے ہیں کہیں　　اور طعنے زہر آگیں نیک و بد کے ہیں کہیں
ہرزہ کاری میں کٹے افسوس ساری زندگی　　آہ یوں برباد ہو جائے یہ پیاری زندگی
روحِ مضطر کو کسی ایسی جگہ لے جاؤں میں!　　کشمکش سے چھوٹ جاؤں اور تسکیں[1] پاؤں میں
پاک ہو جائے جہاں آلائشِ دنیا سے دل　　جوڑ لے اپنا تعلق عالمِ بالا سے دل
فکر کوئی بھی نہ ہو دل کو بہ جز فکرِ معاد!　　ذکرِ خالق ہر گھڑی ہو ہر گھڑی خالق کی یاد

یہ چند شعر ہیں اس نظم کے جس میں محروم اپنی آرزو کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نظم محروم کے خصائصِ شعری کی مکمل تصویر ہے۔ اگر فقط کسی ایک نظم سے محروم کو جانچنا ہو تو یہ نظم پیش کی جا سکتی ہے۔ جو کچھ محروم ساری عمر میں کہہ سکا ہے، میرے نزدیک یہ اس کا خلاصہ ہے۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی، ہم جنسوں کی شکایت، فکرِ آخرت، درسِ اخلاق، اظہارِ درد، غرض سب کچھ ہے۔ آخر میں اس دکھ بھری دنیا سے بیزار ہو کر کس حسرت سے کہتا ہے، اور صرف محروم ہی کہہ سکتا ہے۔

---

[1] تسکین میں نون کا اعلان ہونا چاہیے۔ (ذ فکر)

دردکا میرے علاج اے ساحلِ گنگا نہیں؟
کیا تمہارے دامن میں کوئی بھی مقام ایسا نہیں؟

محروم کی وہ نظمیں جن میں وہ ایک استاد (شاید اس لیے کہ محروم کی ساری عمر تربیتِ اطفال اور درس و تدریس میں گزری ہے) کی حیثیت سے نصیحت کرتا ہے۔ کس قدر خشک موضوع ہے۔ لیکن محروم کی قادرالکلامی اور شاداب خیالی نے اس صحرا میں بھی گلہائے مضمون کھلائے ہیں۔ شراب کی مذمت میں کہتا ہے ؎

فریبِ دہر نے تدبیرِ جانستانی کی | شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
جلا کے جوہرِ ادراک کو دھواں کر دے | دماغ کو وہ اُبالے کہ نیم جاں کر دے

یہ شعر صداقتِ احساس کی کتنی روشن تصویر ہے ؎

ابھی مقاصدِ تعلیم سے ہیں دُور بہت | اگرچہ پاس کراتے ہیں امتحاں استاد

ایک شعر ہے ؎

خیال بیج ہے اعمال کے درختوں کا | خیالِ نیک وطیرہ ہے نیک بختوں کا

۱؎ محروم کا سب سے پہلا شعر جو میں نے سنا یہ تھا۔

۲؎ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ خلافِ محاورہ ہے۔ میں نے ان کی عقل پر ماتم کیا اور کہا کہ جوہرِ ادراک کی خاک سے جوہرِ ادراک کا دھواں زیادہ بلیغ ہے۔ اور یہ کہ محلِ محاورہ نہیں۔ لیکن وہ اڑے رہے۔

"گنج معانی" کا آخری حصہ ان نظموں پر مشتمل ہے جنھیں مرثیہ کہا جاتا ہے۔ انیس کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ قدرت اس طرف سے کچھ بے نیاز ہو گئی ہے لیکن محروم کے مراثی نے اس خیال کی تردید کر دی۔ میرے خیال میں محروم کو صرف مرثیہ کہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ دیگر اصنافِ شاعری میں گلباریاں کرتا ہے تو یہ اس کی قادر الکلامی ہے۔ لیکن محروم کی طبیعت اس بات کی شاہد ہے کہ اس کا اصل موضوع مرثیہ ہے۔ پھر حادثات اور واقعات نے اس احساس میں شدت پیدا کرنے کے لیے محروم کو جس طرح کسا اور جھنجھوڑا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محروم سے فطرت مرثیہ گوئی کا کام لینا چاہتی ہے۔

ان مراثی میں چند مرثیے ایسے ہیں جو محروم نے ہم عصروں کی وفات پر کہے ہیں۔ آہ ہماری تہذیب کا یہ خوشگوار پہلو جو محروم کے ان مراثی سے ظاہر ہے روز بروز خود ہی مناقشات کی گرد میں گم ہوتا جا رہا ہے، اور غالباً محروم ان بے لوث اور خوشگوار تعلقات کی آخری نشانی ہے۔ جو ہندو مسلم صاحبانِ کمال میں اس لیے پائے جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے کمال کی قدر کرتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ اردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کے لیے کئی محروم پیدا ہوتے لیکن حالات اس کے برعکس ہیں اور محروم کے بعد موجودہ شعرا میں سے کسی سے اس اخلاص و ایثار کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ سرور، نادر، طالب، چکبست گرامی، شاطر کی وفات پر بلا امتیازِ عقائد و مذہب محروم نے جس طرح اشکباری

کی ہے، وہ ہم سب کے لیئے سبق آموز ہے۔

سرور کے مرثیے میں ایک شعر ہے ؎

آہ گلچین اجل سے کیسی نادانی ہوئی | پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

ایک بند کی کیف انگیزی ملاحظہ ہو ؎

آرزو جنت کی تھی؟ ہندوستاں کچھ کم نہ تھا | سیر شاعر کے لیئے یہ گلستاں کچھ کم نہ تھا
گنگا جمنا کے مناظر کا سماں کچھ کم نہ تھا | زمزم و کوثر سے یہ آبِ رواں کچھ کم نہ تھا

ہند میں ساماں تھے سارے جنت الفردوس کے
کس لیئے ترکِ وطن کا پھر خیال آیا تجھے

محروم کی عظمت میرے دل میں کس قدر بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم کرتا ہوں کہ محروم نے سرور آنجہانی کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مراسم تو در کنار، آخر محروم کو کس چیز نے تڑپایا؟ یقیناً سرور کے کمالِ شاعری نے۔

نادر کے مرثیے کا ایک شعر ؎

اک چہکتی ہوئی بلبل کا گلا یوں گھونٹا | ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

ایک شاگرد کا نوحہ لکھا ہے۔ آہ! کتنا درد انگیز ہے۔ کتنی پاکیزہ مثال ہے، استاد اور شاگرد کے روحانی تعلق کی۔ "دل" اور "بل" کا فرق دیکھنا ہو تو یہ دل گداز نظم پڑھیئے۔

اقبال کا مشہور قطعہ ہے (دیکھئے صفحہ ۲۳۰ پر)

جانا مرگ چکبست کے مرثیے میں کہتا ہے ؎

وطن کو تیری ضرورت تھی آہ! اے چکبست
چلا ہے لیکے عدم کی تو راہ اے چکبست

ملاقات کی حسرت ملاحظہ ہو ؎

زباں پہ جب کبھی آتا تھا لکھنؤ کا نام
تو اس خیال سے ہوتا تھا خوش دلِ ناکام

کبھی تو آئے گی ایسی سعادتِ ایام!
ملیں گے حضرتِ چکبست سے بشوقِ تمام

ملیں گے اب بھی مگر آہ ! کب ؟ کہاں ؟ کیوں کر ؟
یہ راز اپنی نگاہوں سے ہے نہاں یکسر

ماتمِ گرامی کا مطلع ہے ؎

تصویرِ درد و حسرت و رنج و محن ہے آج
ماتم میں آہ کس کے عروسِ سخن ہے آج

لٹتے تھے جس میں بادۂ شیراز کے سبو
عبرت فضا اُجڑ کے وہ بزمِ کہن ہے آج

نغموں کو آہ موت نے شیون بنا دیا
لبریزِ آہ و نالہ فضائے وطن ہے آج

نذرِ اجل ہے جانِ گرامی ہزار حیف
رخصت ہوا وہ شاعرِ نامی ہزار حیف

آہ کتنے حسرت ناک شعر ہیں ؎

اے یادگارِ حافظ و عرفی کہاں ہے تو
اب ہم کریں گے کس کے کمالِ سخن پہ ناز

---

[1]
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

وہ سوزِ تشنگی کو بجھائیں گے کس جگہ　　　ہے جن کے دل میں ذوقِ شرابِ جگر گداز

ان مراثی کے بعد محروم کے وہ مرثیئے آتے ہیں جنھیں پڑھنے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ بیوی کے مرثیہ "اشکِ حسرت" کے مطلع کی دلگدازی دیکھیے ؎

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری؟　　　ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری

کہاں ہے آج تمھاری وہ طرزِ غمخواری؟　　　کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی؟

چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی؟

کوئی صاحبِ دل ہے کہ اس بند کو بغیر آنسو گرائے پڑھ جائے؟

اُردو میں محبوب کو مخاطب کرتے وقت مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پنجابی میں ہر قابلِ احترام عورت کے لئے بھی مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے محروم نے جہاں قریب المرگ بیوی سے خطاب کیا ہے مذکر کا صیغہ استعمال کیا ہے ؎

مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے　　　رُکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

اس مرثیئے میں اپنی خورد سال بچی کی سادگی اور یتیمی کا جو رنگ محروم نے دیا ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ میں اس سارے مرثیے کو باوجود سات آٹھ مرتبہ کی کوشش کے سارا نہیں پڑھ سکا۔

۰ دردناک منظر" نظم نہیں ہے، ایک نشتر ہے، ماں کی لاش پر بے خبر بچی آتی ہے، اُسے محروم کی زبان سے سنئے اور سر دُھنیئے۔

ہندوؤں میں گنگا کو پھول لے جانے کی رسم ہے۔ پھول کو ادب و شعر میں جو درجہ حاصل ہے، اس کی نسبت نے اس نظم کو ایک سدا بہار پھول بنا دیا ہے۔

محروم کی بیوی کا انتقال نومبر میں ہوا، اسی نومبر میں جس میں اس پر تنقید لکھی جا رہی ہے، اسی نومبر کی ایک صبح کو محروم اپنی بیوی کی موت پر آنسو بہاتا ہے، اور صبح نومبر کی دلآویزی بیان کرنے کے بعد کہتا ہے ؎

مارا ہوا ہوں ایک نومبر کی صبح کا
ہے انتظار اب مجھے محشر کی صبح کا

"سارس کا جوڑا" دیکھ کر محروم کو اپنی بیوی یاد آتی ہے۔ پھر محروم کیا کہتا ہے، یہ "گنجِ معانی" میں دیکھئے۔ بہار آتی ہے تو محروم کا غم پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ غرض زندگی کی ہر حرکت پر وہ اپنی شریکِ حیات کو یاد کر کے روتا ہے اور رُلاتا ہے۔ ایک تو شاعر کی طبیعت غم دوست، اس پر ایسا غم، اور محروم جیسا شاعر ؎

صبح دم یاد مجھے تیری چِتا آتی ہے
شعلۂ سُرخ جو مشرق میں عیاں ہوتا ہے

مراثی کے بعد تقریبات ہیں۔ محروم نے اس آورد میں بھی آمد کا حق ادا کیا ہے۔ پھر تضمینات ہیں۔ بعض تضمینوں میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محروم نے کہنے والے کے منہ سے شعر چھین لیا۔ خاتمے پر کچھ رباعیات بھی ہیں، اور خوب ہیں۔ "گنجِ معانی" ہر صاحبِ ذوق کو پڑھنی چاہیئے۔

"چندن" لاہور

جنوری ۱۹۳۳ء

میرے والد

جگن ناتھ آزاد

مسلسل پینتیس برس تک سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت کرنے کے بعد والد
جب کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ہیڈماسٹری سے ریٹائر ہوئے تو انھوں
نے اپنے اس عرصۂ ملازمت کا جائزہ ان اشعار میں لیا ؎

سی و پنج سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد   سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم
ثمر فہم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی   بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

یہ ہیں ایک شاعر کی مسلسل پینتیس برس کی ملازمت کے تاثرات۔

پینتیس برس — زندگی کا ایک حصّہ — بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں
سلام کردم — اور اس کے باوجود مسلسل تخلیقِ فن کا سلسلہ جو آج تک جاری ہے"

پینتیس برس کی اس مسلسل گھٹن کا اندازہ ان تنقیدی یا تعریفی مقالات سے نہیں ہو سکتا جو مختلف رسائل اور کتابوں میں والد اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ والد کی زندگی کے وہ گوشے جو ان کے تخلص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں، اور اس قطعے میں خوابیدہ ہیں ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے۔ میں اس مقالے میں بعض ایسے ہی گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد سے جب میں نے ذکر کیا کہ طفیل[۱] صاحب کا خط آیا ہے اور انھوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں مقالہ لکھنے کے لئے کہا ہے، کچھ مشورہ دیجئے کیا لکھوں تو کہنے لگے کہ میری زندگی میں ایسے واقعات پیدا ہی نہیں ہوئے جنھیں رسالے کے لئے لکھا جائے اور جو واقعات ہیں وہ مل جل کر ہمارے سماج کی کوئی عمدہ تصویر پیش نہیں کرتے۔ پنجاب کی تلخیوں اور تعصبات کا زمانہ۔ اسے دہرانا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ میانوالی اور راولپنڈی کے واقعات تو تمھیں یاد ہی ہوں گے۔ اگر مفتی احمد سعید اور بیرسٹر محمد جان میری امداد نہ کرتے تو متعصب لوگ میری زندگی ہی دشوار بنا دیتے۔ اب بھی انھوں نے کچھ کم پریشان نہیں کیا، اس سے پہلے بھی جب تم بہت چھوٹے تھے مجھے مخالفوں نے مسلسل کئی برس تک پریشان کیا۔ یہ باتیں لکھنے کی تھوڑا ہی ہیں۔

انھوں نے مقالہ نہ لکھنے کی جو وجہ بیان کی وہی میرے لئے یہ چند سطور لکھنے کی وجہ جواز بن گئی۔ پریشان کرنے والے لوگوں یعنی بعض مسلمانوں نے برہنائے تعصب

---

[۱] یہ مقالہ جناب محمد طفیل مدیر "نقوش" لاہور کی فرمائش پر نقوش کے شخصیات نمبر (۲) کے لئے لکھا گیا۔

مخالفت کی، اور امداد کس نے کی؟ مسلمانوں ہی نے۔ اب ایک غیر مسلم شاعر کی زندگی کا یہ گوشہ پڑھنے والوں کے سامنے کیوں نہ آئے۔ اس سے بڑی وجہ ایک شاعر کی داستانِ حیات لکھنے کی اور کیا ہو سکتی ہے، اور پھر جتنی قدردانی ہوئی وہ کن لوگوں نے کی؟ کیا ان میں سے بیشتر مسلمان نہیں تھے؟ تو گویا یہ تو تاریخِ ادب کا ایک ایسا باب ہے جو آج سے بہت پہلے معرضِ تحریر میں آجانا چاہیئے تھا۔

۱۸۸۱ء والد کا سنِ پیدائش ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے عیسیٰ خیل کی تحصیل میں گاجراں والا نام کا ایک گاؤں تھا، جو ان کی جنم بھومی ہے۔ یہ گاؤں اُسی زمانے میں دریا برد ہو گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی تھوڑی بہت کاشتکاری اور معمولی دوکانداری کو چھوڑ کر عیسیٰ خیل آگیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ والد کی عمر اُس وقت پانچ سات برس کی تھی، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرا بچپن دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ موسمِ گرما میں عموماً سارا سارا دن اس دریا میں نہانے اور تیرنے میں گزر جاتا تھا۔ ساون بھادوں میں جب سارا گاؤں زیرِ آب ہو جاتا تھا تمام مکان (کچے گھروندے اور چھپر) گر جاتے تھے اہلِ دہ کے لئے یہ بڑا حادثہ ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے عادی ہو چکے تھے، کسی نہ کسی طرح طرح گزارا کر ہی لیتے تھے۔ ہم بچوں کے لئے تو پانی کا اس طرح موجیں مارتے ہوئے

تاریخِ تصویر سنہ ۱۹۰۶ء
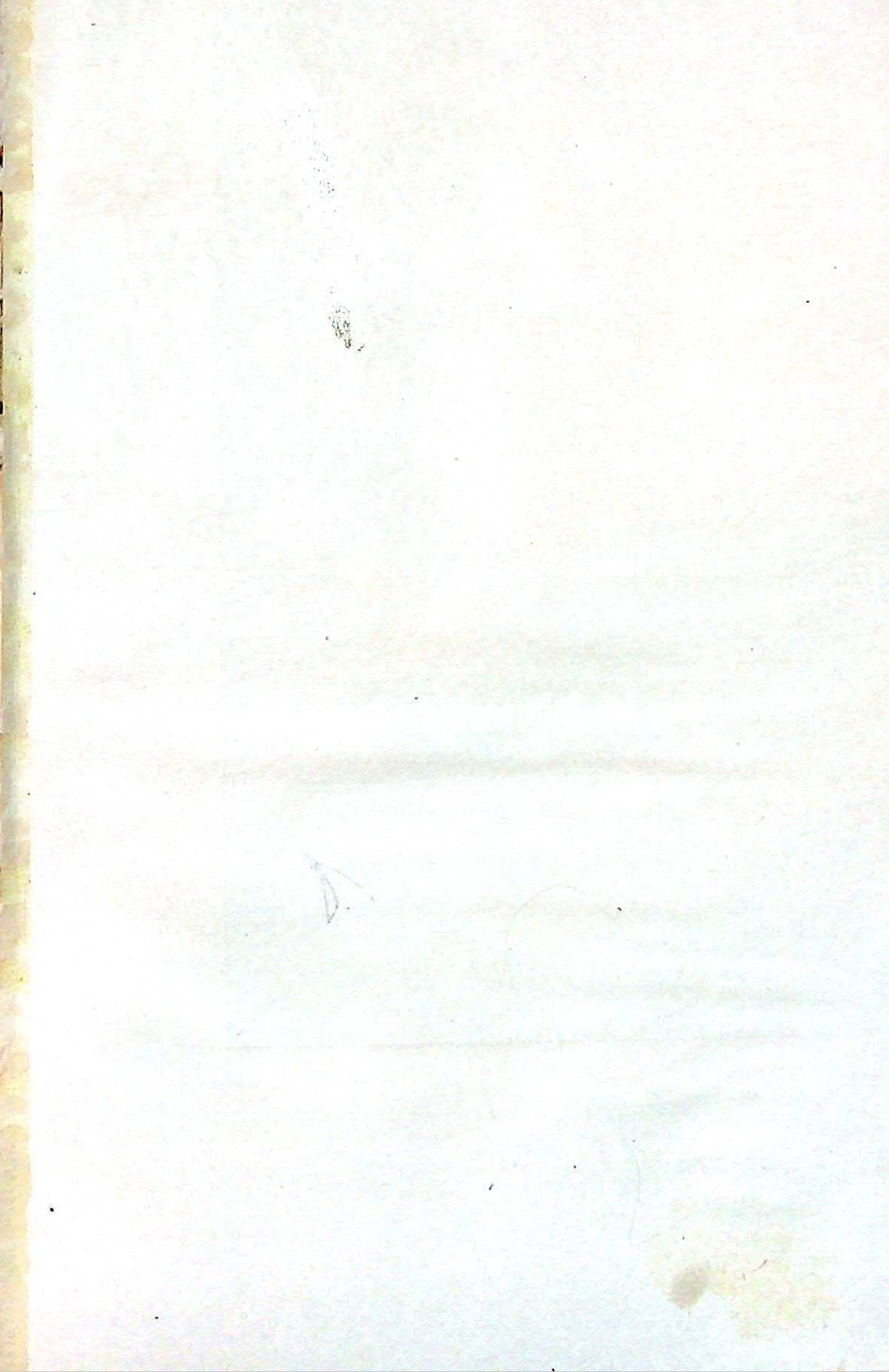
گھروں میں پہنچ جانا باعثِ مسرت ہوتا تھا۔ گرے ہوئے ملبے سے کواڑوں کے تختے لے کر ان کی کشتیاں بنا لینا اور اِدھر اُدھر کھیلتے رہنا ان ایام میں ہمارا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ اب جو غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ؎

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے

خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط جو آج بھی اُن کی گفتار اور اشعار میں موجود ہے، اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایک تازہ ترین نظم میں کہتے ہیں ؎

بھولا نہیں عالم تری امواجِ رواں کا — وہ ماضیٔ رقصاں مری عمرِ گزراں کا

تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا — افسوس کہاں میں ہوں یہ قصہ ہے کہاں کا

گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا

طفلی بھی جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا

تقدیسِ چمن سے مجھے انکار نہیں ہے — گویا کہ نہیں اس سے سروکار نہیں ہے

کیا کیجیے وہ آر نہیں پار نہیں ہے — آسودہ کسی طور دل زمانہ نہیں ہے

وہ ہمہمہ وہ جوش و خروش اس میں کہاں ہے

افسردہ سی، بے جان سی، اک نہر رواں ہے

گو جور و جفا کی تجھے عادت بھی رہی ہے — فطرت تری کچھ مائلِ وحشت بھی رہی ہے

مضمر ترے طوفان میں آفت بھی رہی ہے — ساتھ اس کے نمایاں یہ حقیقت بھی رہی ہے

دیہات اُجاڑے تو بسائے بھی ہیں تونے
نقشے جو بگاڑے تو بنائے بھی ہیں تونے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ
آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ

تھا جلوہ گہ حسنِ خدا داد جو قریہ
ہر قیدِ تکلف سے تھا آزاد جو قریہ

بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون تو ہوگا وہی ہو گرچہ زمیں اور

کوئی چھ سات برس کی عمر میں انھیں ورنیکلر فائنل مڈل اسکول عیسیٰ خیل میں باقاعدہ داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری سے ہائی اسکول تک ہر جماعت میں اوّل رہے۔ پانچویں اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی اسکول نہ تھا۔ اس لئے گھر سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر بنوں جاکر وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں میٹرکولیشن کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحان بعد میں بہ دورانِ ملازمت پاس کئے۔

میٹریکولیشن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہونے کے لئے بنوں سے لاہور آئے۔ رستے میں پہلی بار ملکۂ نورجہاں کا مقبرہ دیکھا۔ ان کی مشہور نظم "نورجہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ والد بتاتے ہیں کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف بیلیں چڑھی ہوئی ہیں، اور ویرانی کا عالم

نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں جب میں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تھا، اس مقبرے کی کیفیت واقعی یہی تھی کہ ؎

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر — آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپّر — اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور ہے یوں گورِ غریبانہ کسی کی
آباد رہے محفلِ جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہ ایک فقیر طبع انسان تھے۔ آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے اور جب کوئی سادھو سنیاسی مل جاتا اُس کے ساتھ ہو لیتے، اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے تھے۔ چھوٹے دادا اردو اور فارسی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اوائل عمر میں انھوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی، لیکن اُسے جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ایک سال کی بچّی رہ گئی ـــــ وِدّیا ـــــ میری بہن جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے مسرّت چھین لی۔

اگلے برس دوسری شادی ہوئی۔ یہ میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔

دو برس بعد ۱۹۱۸ء میں میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر کے واقعات میری یادوں کے دھندلکے میں ابھی تک موجود ہیں۔ گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ

ہی کی نہیں، بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں پہلوؤں کی حامل ہوں گی۔

آج سے چونتیس برس پہلے کا زمانہ میری نظر کے سامنے ہے۔ عیسیٰ خیل میں ایک چھوٹا سا مکان ہے، والد، والدہ، ووّیا اور میں۔ ہم چار افراد اس میں رہتے ہیں، سردیوں کے دن ہیں، والد کوٹھے کی چھت پر دھوپ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے سامنے ہے، گنگنا رہے ہیں، والدہ مجھے اور ووّیا کو اوپر بھیجتی ہیں کہ جا کر کہو بازار سے ترکاری لے آئیں۔ ہم دونوں اوپر جاتے ہیں، دو ایک بار انھیں پکارتے ہیں لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم اس خوف سے کہ کہیں جھڑک ہی نہ دیں فوراً واپس آ جاتے ہیں۔ اخبار یا کتاب کی جانب اُن کی محویت کا آج بھی یہی عالم ہے۔ وہ محوِ مطالعہ ہوں تو اُنھیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے دو چار بار پکارنا بالکل بے سود ثابت ہوتا ہے۔ انکی محویت سے قطعِ نظر ان کا خوف اسی تصویر کا ایک اور پہلو ہے جو ایک زمانے تک قائم رہا، اور جس کے بچے کھچے نقوش آج بھی باقی ہیں۔

میرے اور ووّیا کے دل میں ایک مدّت تک والد کی محبت کے مقابلے میں شاید ان کا خوف زیادہ غالب رہا۔ یہ اُن کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ اس خوف کا مفہوم ممکن ہے نئی نسل کی سمجھ میں نہ آسکے۔ کیونکہ "بزرگِ خاندان" کا تصور نئے دور میں قریب قریب رو بہ زوال ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ افتادِ مزاج شفقتِ پدری کے

رستے میں حائل رہی ، بلکہ جہاں تک میرا اور ودیا کا تعلق ہے ہمیں اس شفقت کا حصۂ فہم ملا ہے ۔ ہاں میری چھوٹی بہنیں ساوتری اور کرشنا اس محبت سے پوری طرح شاد کام نہیں ہو سکیں ، کیونکہ انھوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب ودیا کی خودکشی کے باعث والد کا دل بجھ چکا تھا ۔ ودیا نے جو بائیس برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی سسرال میں ایک جھگڑے کی بنا پر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا دی تھی ۔ وہ دن اور آج کا دن والد کے چہرے پر میں نے وہ مسرت نہیں دیکھی جو اس حادثے سے قبل نظر آیا کرتی تھی ۔ والد کی زندگی کا یہ حادثہ کئی انداز سے شعر میں ڈھل کر آیا ، لیکن انھوں نے اپنے اس ذاتی غم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا ، اس لیے یہ اشعار آج تک کہیں منظرِ عام پر نہیں آسکے ۔

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا
افسوس اسی شمشان میں کھائیں گے ہم پینگے

تو مرنے پہ مجبور رہی مر گئی جل کر
ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

بجھ نہیں سکتی جو دل میں آگ ہے بھڑکی ہوئی
عالمِ فانی میں اب راحت کہاں میرے لئے

سچ تو یہ ہے تیرے جل مرنے سے اے لختِ جگر
ہو گئے دوزخ زمین و آسماں میرے لئے

پہلے ہی غم افسانہ تھی وہ میری نظر میں
افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا

اے لختِ جگر ! آہ کہ جل مرنے سے تیرے
میرے لئے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

تاب اک لوکے کی لاسکتی نہیں جانِ بشر — ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے انساں بیقرار
ہائے کن مجبوریوں میں تو نے اے لختِ جگر — کرلیا ملبوس تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دلِ بے تاب جلتا ہی رہے گا اس کی حدّت سے — زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی دُدیا
جگر پھنکتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں — تصوّر میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی دُدیا

کینِ فلک اے وائے کہ داغِ جگرم داد — فریاد برآوردم و داغِ دگرم داد
ایں داغِ جگر پارۂ خونِ جگرم سوخت — دیں داغِ دگر آہ کہ سرتا بسرم سوخت

"آں داغِ جگر" اشارہ ہے میری چھوٹی بہن کی موت کی جانب ۔ یہ بچی دو برس کی عمر میں دس بارہ دن بیمار رہ کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی ۔ اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا، بلکہ دفنایا گیا تھا ۔ والد اور میں مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے ۔ وہاں سے واپسی پر والد ہر روز ایک نظم کہتے تھے ۔ تین دن کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا ۔ یہ نظمیں بھی جہاں تک میرا خیال ہے کہیں شائع نہیں ہوئیں ۔ چند اشعار مجھے زبانی یاد ہیں، یہاں درج کر رہا ہوں ؎

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں — اُٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا

وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک
یاں رات تو نے کیسے گذاری شکنتلا

خوابِ گراں میں تو ہے ابھی زیرِ خاک سرد
بیدار کائنات ہے ساری شکنتلا

خوش ہو کے پھر اچھل کہ جگن میرے ساتھ ہے
آنکھوں سے اس کی اشک ہیں جاری شکنتلا

آنکھوں میں آگیا دلِ صد چاک کا لہو
پتھر یہ تجھ پہ دیکھ کے بھاری شکنتلا

ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر!
کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آگئے
اے کاش زیرِ خاک سے ہو آشکار تو

ہم دودھ لے کے آئے تھے گھر سے ترے لئے
دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیرخوار تو

گھر میں تو رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ
آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تو

افسوس عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات
جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بے قرار تو

روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج
وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو

بھولا غمِ جہاں تجھے جب گود میں لیا
آئی تھی بن کے راحتِ جانِ نزار تو

جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب
اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

تیرے لئے دعا ہے دلِ غم نصیب کی
ہو بہرہ یابِ رحمتِ پروردگار تو

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب
کس نے شکنتلا تجھے یوں کر دیا خموش

مطلب یہ تھا کہ تو مرے نالوں سے جاگ اُٹھے
فطرت میں تو رہنے ہے دلِ درد آشنا خموش

مجھ بد نصیب کے لئے تیری خموشیاں
ایمائے خامشی ہیں تو ہو جاؤں گا خموش

طاری ہے آہ شہرِ خموشاں پہ کیا سکوت
خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش

سرمنزلِ دیارِ عدم ہے یہی مقام
ڈیرے لگے ہوئے ہیں مگر بے صدا خموش

وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اُترتے ہیں
سینے میں سانس روک کے جوں نقشِ پا خموش

دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں
پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش

نغمے خوشی کے ہیں نہ کہیں نالہ ہائے غم
یکسر ہیں ساکنانِ دیارِ فنا خموش

صدمہ نہ تاکہ ہو تری معصوم روح کو
ہوتا ہے سازِ اب مری فریاد کا خموش

شکنتلا کے ذکر سے پہلے میں وِدیا کی خودکشی کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہم راولپنڈی میں تھے۔ جس روز دوپہر کو اس حادثے کی اطلاع تار کے ذریعے سے ملی اسی روز جب صبح کو ـــــ حادثے کی اطلاع سے پانچ سات گھنٹے قبل ـــــ والد بیدار ہوئے تو میں نے انھیں خلافِ معمول بہت افسردہ پایا، میں نے ان سے دو ایک بار پوچھا کہ طبیعت تو آپ کی اچھی ہے؟ رات کو نیند تو ٹھیک سے آئی؟ انھوں نے کہا۔ ہاں بالکل اچھا ہوں، کوئی خاص بات نہیں

ہے۔ یونہی طبیعت پریشان سی ہے۔ حسبِ معمول سیر کو چلے گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ افسردگی کا عالم بدستور طاری تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسکول یا کنٹونمنٹ بورڈ کا کوئی معاملہ پریشان کر رہا ہوگا، دوبارہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کنٹونمنٹ اسکول کی ہیڈماسٹری ان کے لئے دردِ سر تھا۔ میرا گمان یہی رہا کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس دن اسکول جانے تک والد خلافِ معمول خاموش ہی رہے۔ اپنی پریشانی کو چھپانا ان کے بس میں تھا نہ ہے۔ دوپہر کو تار ملا جس میں یہ الفاظ درج تھے (VIDYA DIED THIS MORNING) وہی صبح کا وقت جب والد افسردہ خاطری کے عالم میں بیدار ہوئے ہیں، ودیا اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر رہی تھی۔ مہر پدری کو اس حادثے کی اطلاع کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی رہی تھی۔

یہ میری بہنوں کی زندگی اور موت کا ذکر تھا جو بلا ارادہ نوکِ قلم پر آگیا، ورنہ میں کہہ تو یہ رہا تھا کہ آج سے چونتیس برس پہلے ہم لوگ کیسے رہتے سہتے تھے عیسیٰ خیل (مغربی) پنجاب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمارا وطن ہے اس لئے محبوب ہے، ورنہ زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں اس شہر میں قطعاً مفقود ہیں۔ زندگی کی اوّلین ضرورت پانی یہاں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اب نہ جانے کیا کیفیت ہے۔ میں اپنے وقت کی بات بتا رہا ہوں۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا۔ شہر کی عورتیں ہر صبح و شام اپنے سر پر دو دو گھڑے رکھ کر پانی بھرنے جایا کرتی تھیں، اور گھر کی ضروریات

کے مطابق دن میں کئی کئی بار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوا باہر کا سارا کام مردوں کے سپرد تھا، اور گھر کے اندر کا سارا کام عورتوں کے سپرد۔ یہ پانی اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ پیا جائے لیکن سارا شہر یہی پانی پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی عمر میں اس شہر سے نکلے، اور بنوں، لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں چودہ برس گذارنے کے بعد جب دوبارہ عیسیٰ خیل میں آئے تو شہر کے پانی سے بیزار ہو گئے۔ انھیں ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ یہ پانی ہم لوگوں کو بیمار کر دے گا۔ چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں میں پھٹکڑی کی ڈلی پھیرا کرتے تھے، اور ہم لوگوں کو یہ خاص ہدایت تھی کہ پانی گلاس میں اس طرح سے انڈیلیں کہ تہ کے قریب کے پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ اس تمام احتیاط کے باوجود پانی نے اپنا اثر دکھایا، اور والد بیمار پڑ گئے۔ پانی کی مٹی نے جمع ہو ہو کر گردے میں پتھری کی صورت اختیار کر لی تھی، شدتِ درد کے ناقابلِ بیان عالم میں انھیں چارپائی پر لٹا کر پھر اسی شہر بنوں میں لے جایا گیا جہاں وہ ایک مدت تک زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹر پینل ایک مشہور انگریز ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے اپریشن کر کے پتھری خارج کی، اور والد انتہائی نقاہت کے عالم میں واپس گھر آئے۔ اب ہر لمحہ عیسیٰ خیل کو چھوڑنے کی تجویزیں پیشِ نظر تھیں، لیکن اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی احمد سعید میانوالی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے، گجرات ان کا

وطن تھا۔ نیک خصلت اور تعصب سے بالا انسان تھے۔ ذوقِ سخن رکھتے تھے۔ والد کے مداح تھے اور قدر دان۔ ان سے والد نے اپنی مشکل بیان کی کہ اس شہر سے مجھے نکالئے، ورنہ پھر بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے ان کا تبادلہ کلورکوٹ کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

کلورکوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں کے اردگرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں یہاں بکثرت آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ بادل اٹھتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ نعمتِ غیر مترقبہ ــــ صاف ستھرا پانی ــــ جس کی تلاش میں والد نے اپنا شہر چھوڑا تھا یہاں بافراط موجود تھا۔ اب والد کو یقین ہو گیا کہ یہاں پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچروں میں شاید ہی جماعتوں سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ ان کی ذہنیت وہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک ٹیچر صاحب نے ایک دن اپنے طلبا سے کہا کہ کل سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے ایک ایک اکنّی لے کر آئیں۔ مجموعی رقم سے کلاس روم کے لئے جھاڑن خریدا جائے گا۔ والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھیں ضابطے اور اخلاق کے پیشِ نظر یہ بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے اس ٹیچر کو بلایا، اور اس سے کہا کہ یہ حرکت تمھارے لئے اور سارے اسکول کے لئے بدنامی کا باعث ہے۔ جب

سرکاری طور پر کلاس روم کے لیے ڈسٹر مہیا کیے جاتے ہیں تو خلاف قاعدہ طلباً سے پیسے جمع کرنے کے کیا معنی؟ وہ صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن انھوں نے دوسرے ٹیچروں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ کرتا ہے۔ کلور کوٹ میں آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان شہر سے دور مختلف دیہات میں آباد تھے۔ ان میں رئیس اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی تھے، خوش حال اور کھاتے پیتے بھی اور ایسے بھی جنھیں مفلس کہا جائے۔ ان دیہات میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے معمولی پرائمری اسکول بھی کوئی نہ تھا، انگریزی مڈل کا تو کیا سوال؟ لہٰذا مسلمان طلباء کے لئے کلور کوٹ میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، جب ہم کلور کوٹ میں آئے تو اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے ان دیہاتی طلبا کی سہولت کے لئے ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کر دیا جس میں ہشیار مسلمان طلبا دیہات سے آکر داخل ہو گئے۔ اور اسکول میں ان کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اس بات سے دیہات کے تمام مسلمان خواہ وہ لوگ نمبردار تھے یا ذیلدار، معمولی کاشتکار تھے یا دوکان دار، بہت خوش ہوئے۔ کیوں کہ ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی، لیکن اسکول کے ٹیچروں کی ذہنیت جو تھی وہی رہی۔ ایک ٹیچر نے بورڈنگ [illegible] ؤس سے دو چارپائیاں چرالیں لعد جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے والد کو متعصب ہندو کہنا شروع

کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ ٹیچر لوگ ایسے تھے جو کسی طرح معلّمی کے مقدس کام کے لئے موزوں نہیں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز دو ایک طلبا کو اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے، اور وہ طلبا وہاں دن بھر طرح طرح کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ کام یہ ہوتے تھے۔ گائے بھینس کے لئے کھلی اور چارے کا انتظام، چارپائی وغیرہ کی بُنائی، گھر کی صفائی اور بچّوں کو اِدھر اُدھر لئے پھرنا وغیرہم۔ ایک اور صاحب نے طلبا کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں، اور اپنی اپنی باری کے مطابق ہر طالب علم اُن کے لئے گھر سے لسّی لایا کرتا تھا۔ ٹیچر صاحب لسّی میں مکھّن کی موجودگی پر بھی اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک ٹیچر صاحب جیب میں تاش ڈال کر اسکول آیا کرتے تھے، اور جب موقع ملتا وہ تین ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ والد ان بدعنوانیوں کو گوارا نہ کر سکے۔ مشورہ، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے سے انھیں روکنا چاہا۔ انھوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مفتی احمد سعید ایک شریف اور غیر متعصب مسلمان تھے۔ ان پر ان شکایات کا مطلقاً کوئی اثر نہ ہوا، اور سازشیوں کو ہر بار منہ کی کھانا پڑی۔ لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مختلف مزاج کے افسر تھے۔ انھوں نے ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے خلاف انکوائری قائم کی گئی۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔

مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیئے والد نے اتنا کچھ کیا اور انکوائری اس الزام کی تحقیق کے لیئے ہو رہی تھی کہ یہ متعصب ہیں اور مسلمان طلبار اور ٹیچروں کو پریشان کرتے ہیں ۔

بہ جرم عشق توام می کشند وغوغا ایست

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ایست

انھوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط لکھا ۔

"فرداو دے کا تفرقہ یک بار مٹ گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی"

لیکن وہ اب دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر خود انکوائری کے لیئے تشریف لائے، ڈاک بنگلے میں عدالت قائم ہوئی۔ شہر کے ہندوؤں کو تو گواہی کے لیئے بلایا نہ گیا تھا دیہات کے مسلمان اور اسکول کے ٹیچر اور طلبار موجود تھے۔ ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ٹیچروں نے دو چار معصوم طلبار کو تو ورغلا لیا، لیکن دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور وفادار مسلمان طلبا نے سازشی ٹیچروں کے خلاف گواہی دی اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو اس بات پر مجبور کیا کہ موجودہ ہیڈ ماسٹر کا کلورکوٹ سے بالکل تبادلہ نہ کیا جائے، کیونکہ اندیشہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام شاید جاری نہ رہ سکے۔ والد کے لیئے یہ ایک عظیم فتح تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اس ماحول سے دل برداشتہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگرس کی تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ والد نے قومی اور ملکی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہیں اور یہ تمام نظمیں بغیر نام کے مختلف اخبارات میں چھپیں۔ اگر نام سے چھپتیں تو نوکری محفوظ نہیں تھی۔ وہ نظم کے ساتھ ایک خط ایڈیٹر کو لکھ دیا کرتے تھے کہ یہ نظم بغیر نام کے یا کسی فرضی نام سے چھاپ دی جائے۔ نہ جانے یہ بات کیوں ان کے ذہن میں نہ آئی کہ اخبارات کی ڈاک سنسر بھی ہو سکتی ہے، اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ ڈاک ہر روز سنسر ہو رہی تھی، والد کے خطوط کی نقل میانوالی کی خفیہ پولیس کو بھیج دی جایا کرتی تھی، اور ان کے بارے میں میانوالی پولیس ایک فائل تیار کر رہی تھی۔ لالہ لاجپت رائے کے انتقال پر انھوں نے ایک طویل نظم کہی۔ یہ نظم لاہور کے ایک پبلشر نے کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ والد کا نام اس نظم پر موجود تھا۔ اس نظم نے پولیس کی فائل کو "مکمل" کر دیا اور یہ فائل ایک انکوائری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اب یہ معاملہ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کا نام رادھا کرشن تھا۔ حکومت کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب بھی انھیں ملا ہوا تھا۔ اس انکوائری میں والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کے اپنے خطوط کی نقول اور بعض حالات میں اصل خطوط اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں موجود تھیں۔ حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی تھی۔

رادھا کرشن ضلع کے دورے پر کلور کوٹ آئے۔ والد کو انھوں نے اسی ڈاک بنگلے میں طلب کیا، اور انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ والد اپنے خلاف اتنا سنگین معاملہ دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں۔ رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق سے سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جایئے۔ یا تو کانگریس کی تحریک میں شامل ہو جایئے یا سرکاری نوکری میں رہیئے۔ وہ تو یہ حکم دے کر چلے گئے۔ والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی۔ لیکن اس سارے واقعے سے انھوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا، لیکن انھوں نے اس واقعے کا جب بھی ذکر کیا بڑے افسوس کے ساتھ کہ وہ بھی کیا نیکی جو تعصّب کی بنا پر کی جائے، شاعر ہونے کی حیثیت سے قدر دانی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تعصّب کی بنا پر قدر دانی کی تو کس کام کی۔ اب بھی جب آپ کبھی اس زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس واقعے کا ذکر افسوس اور اندوہ سے کرتے ہیں۔ عیسیٰ خیل کے مرحوم نواب سیف اللہ خاں کا تذکرہ اس موقع پر وہ ضرور کرتے ہیں۔ سیف اللہ خاں مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تھی تو بغل گیر ہو کر ملتے تھے، اور بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خاں سے نواب احمد یار خاں دولتانہ نے یہ کہہ دیا تھا، کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا

جہاں محروم صاحب رہتے ہیں ؛ انھوں نے والد سے اس واقعے کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ تو ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جائدادوں کے مالک ہم ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ہیڈ ماسٹر سے زیادہ نہیں۔ لیکن ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ سے مشہور ہے، آپ کی ذات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔

کلورکوٹ سے آب و دانہ انھیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے راولپنڈی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ والد کلورکوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی، کوشش کر کے انھوں نے اپنا تبادلہ راولپنڈی کرا لیا۔ یہاں وہ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے ۔۔۔ راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدمؔ کا قیام ان دنوں یہیں راولپنڈی میں تھا۔ عطاء اللہ کلیم، عبدالعزیز فطرت، ضیا، اظہر امرتسری، یہ سب حضرات یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے اُن کا خیر مقدم ایک پر تکلّف دعوت کی صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آ گئی۔ ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوشگوار بن گئی۔ لیکن اسکول کے حالات یہاں بھی دردِ سر بن گئے۔ کلورکوٹ میں تو ایک افسر تھا ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز۔ یہاں کنٹونمنٹ بورڈ کا ہر ممبر افسر تھا ۔۔۔ ایک ممبر محمد رفیع کو تو ان سے پہلے دن ہی سے بغض للّٰہی پیدا ہو گیا۔ اس نے انھیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن ایک اور ممبر محمد جان بیرسٹرایٹ لا

(حال جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ) نے اس کی ایک نہ چلنے دی، اور اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ یہاں وہ ایک ٹیچر محمد رفیع سے مل گئے جس سے والد کی پریشانیوں میں معتدبہ اضافہ ہوگیا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت صفائی کے لمبے لمبے بیانات لکھنے میں ضائع ہو جاتا تھا۔ چند برس بعد محمد رفیع کا انتقال ہوگیا، اور صورتِ حال سکون پذیر ہوگئی۔ یہاں سے آپ ۱۹۴۳ء میں ریٹائر ہوئے، اور آپ نے "سی و پنج سالِ عمرم ... ..." کہکر اطمینان کا سانس لیا۔

فوراً بعد آپ گارڈن کالج راولپنڈی میں اُردو اور فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ مولانا تاجور کو اس تقرر کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تمھارے والد کو جہاں شروع میں پہنچنا چاہیے تھا وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت قریباً ضائع ہی ہوا ہے، انھیں شروع ہی میں اُردو اور فارسی کا لیکچرار مقرر ہونا چاہیے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون میں بسر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا، اور ہنگامۂ کشت و خون میں کپتان عبدالمجید (اللہ انھیں ہمیشہ اور ہر جگہ آبرو سے رکھے) نامی ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر و عافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہ ہزار دقت امرتسر اور پھر جالندھر آئے۔ میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ انھوں نے مجھے خط لکھا کہ "جالندھر تک تو آگیا ہوں، دہلی

پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ ہر طرف ایک افراتفری اور کس مپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا" لیکن کون مسلمان اُس وقت جالندھر میں اس قابل تھا کہ ان کی خدمت کر سکتا۔ بڑی مشکلوں سے دہلی پہنچے، یہاں لالہ دیش بندھو گپتا آنجہانی نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی تک اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں[1] لیکن اتنا لکھنا مضمون کے احاطے سے باہر بھی نہ ہوگا کہ والد ابھی اسکول کے تیسرے درجے ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انھیں پڑھ کر خود بخود اسی بحر میں مصرعے موزوں ہونے لگے۔ بعد میں درسی کتابوں کی نظمیں پڑھ کر واقفیت بڑھنے لگی۔ اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درس طلبا اور ماسٹر صاحبان کے لئے دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء (ساتویں جماعت) میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

---

[1] اس لئے کہ یہ مقالہ "نقوش" لاہور کے "شخصیات نمبر" کے لئے لکھا گیا تھا۔ (ج۔ن۔ا)

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گُل گریباں چاک ہیں

نوحہ انانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اس شعر پر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے جو ایک دہلوی بزرگ تھے بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے ؎

الٰہی تری مہربانی ہوئی | کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

اگرچہ اس دور کی شاعری کچی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث زبان کے نقائص سے خالی نہ تھی لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہو گیا، اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی ہو گئیں جو "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور ایسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ "چڑیا کی زاری" اور "سندھ کو پیغام" مطبوعہ "مخزن" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہو گئی تھی، اور انھوں نے تعریفی جملوں سے ہر نسیم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی، اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ فنِ عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے اسے حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے دامن چھڑا لیا ؎

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا　　بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر　　مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے بارے میں اب ان کی رائے یہ ہے کہ یہ میری سہل انگاری تھی، ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔

عروض کے متعلق ان کی ایک بار علامہ اقبال سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں علامہ کی رائے کا اُنھوں نے مجھ سے اکثر ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے ان سے کہا تھا کہ میں نے تو عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔ ویسے شاعری کے لئے عروض جاننے کی ضرورت نہیں۔ ہاں استادی شاگردی کے سلسلے کے لئے عروض کا جاننا ضروری ہے۔

والد استادی شاگردی کے سلسلے سے بالکل بے نیاز رہے ہیں۔ شعر میں ان کا کوئی استاد ہے نہ انھوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے۔ کسی نے مشورہ مانگا تو بخوشی دے دیا۔ انھیں ہند و پاکستان کے گوشے گوشے سے اس مضمون کے خطوط اکثر ملتے رہتے ہیں کہ میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ آپ جواب میں یہی لکھتے ہیں کہ مطالعہ اور مشق جاری رکھئے۔ جوہر ہوگا تو چمک اُٹھے گا۔ اصلاح لینے سے کچھ نہ ہوگا۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کو بعض کتابوں کے نام مطالعے کے لئے تجویز کرتے رہتے ہیں۔ جن میں "بانگِ درا" "جامِ سرور" "کلّیاتِ داغ" اور "کلّیاتِ امیر مینائی" کے نام ضرور شامل ہوتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ اوّل الذکر دو کتابیں

خیالات میں تنوع اور بلندی پیدا کرنے کے لئے، اور آخر الذکر صفائی زبان کے لئے بہت مفید ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انھوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطور فن حاصل کیا اور نہ اس پر فنی نظر سے توجہ کی۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں سے

شاعر ہوں شاعری میں استاد نہیں　　گو نقدِ سخن ہے پاس نقاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو　　مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے۔ جب طبیعت مجبور کرتی ہے، یا کوئی خارجی تحریک رونما ہوتی ہے تو آپ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بار آپ جو کچھ لکھ لیتے ہیں وہ اس کی قطعی صورت ہوتی ہے۔ میں نے انھیں کلام پر نظر ثانی کرتے نہیں دیکھا۔ گھر میں بچوں کا شور ہو یا غل غپاڑہ ہو، آپ کی شعر گوئی کے رستے میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ہاں کوئی فرمائشی نظم کہنا ہو تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ "اہتمام" ضروری ہو جاتا ہے۔ اکثر آپ کاغذ پنسل لے کر گھر سے دور شہر کے باہر چلے جاتے ہیں، اور وہیں سے فرمائشی نظم ختم کر کے لاتے ہیں۔ اب تو فرمائشی نظمیں لکھنے کی انھیں ضرورت نہیں رہی لیکن جب کلور کوٹ اور راولپنڈی میں ہیڈ ماسٹر تھے تو ڈسٹرکٹ انسپکٹروں اور ڈپٹی کمشنروں کی فرمائشوں پر اکثر اس قسم کی نظمیں کہنا پڑتی تھیں۔ بعض دفعہ تو آپ اس قسم کی نظمیں قلم برداشتہ "لکھ" دیتے تھے۔ اس کی نقل افسر موصوف کو بھیجی اور اصل کہیں پھینک دی۔ میں ان نظموں کی نقلیں کبھی کبھار محفوظ

کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت ان نقلوں کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ مقالہ یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے، اور کتابوں، بیاضوں یا کاغذات سے اشعار نقل کرنے سے اس کی نوعیت بدل جائے گی۔ کلورکوٹ ہی کے زمانے کی بات ہے، ایک دفعہ دریائے سندھ کے سیلاب نے ضلع میانوالی کے کچّ (اطراف دریا کے دیہات) کو برباد کر دیا۔ ملک زمان مہدی خاں ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے، ایس، ڈی، او، کوئی رستم کیانی صاحب تھے۔ طوفان زدہ لوگوں کی امداد کا کام ان افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک فیروز خاں نون وزیر تعلیم تھے۔ وہ امداد کے انتظام کا معائنہ کرنے اور تباہ شدہ لوگوں کی ڈھارس بندھانے آئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے والد کو نظم کہنے کی "فرمائش" کی۔ آپ نے فی البدیہہ نظم کہی۔ چند اشعار سنئے ؎

خستہ جاناں را اماں آید ہمی — مرہمِ زخمِ نہاں آید ہمی

مژدہ باد اے دل کہ دورانِ بہار — بعدِ ایامِ خزاں آید ہمی

در ہوائش پرفشاں گشتیم باز — یادِ عہدِ آشیاں آید ہمی

از سرِ ما شورشِ طوفاں گذشت — پُرسکوں دورِ زماں آید ہمی

ساحلِ امیدِ ما نزدیک شد — در نظر از وے نشاں آید ہمی

از پئے امدادِ طوفاں دیدگاں — کشتیٔ امن و اماں آید ہمی

کارِ عیسیٰ چوں زماں مہدی کند — از حوادث کے زیاں آید ہمی

مانمی ترسیم از دشت بلا — رستم ما از کیاں آید ہمی

از ستم ہائے فلک ما را چہ غم

چوں ملک فیروز خاں آید ہمی

ملک فیروز خاں نون کے نام کا ایک سجع بھی لکھا تھا۔

مئے فیروزیش در جام کردند

از اں فیروز خانش نام کردند

شاعرانہ صلاحیتوں کا یہ امر مجبوری کتنا افسوس ناک استعمال ہوتا رہا!
فی البدیہہ شاعری کا ذکر آگیا ہے تو دو ایک واقعات اور بھی سن لیجیے۔
اس فن میں آپ کو واقعی ایک کمال حاصل ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری سے
آپ کے دوستانہ مراسم ایک زمانے سے ہیں۔ آپ جب کبھی لاہور آتے حفیظ
صاحب سے ضرور ملتے تھے۔ حفیظ صاحب بھی جب کبھی راولپنڈی گئے اپنی مشاعرانہ
مصروفیات کے باوجود والد سے ملنے ہمارے گھر ضرور آئے۔ ایک دفعہ والد
لاہور آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ حفیظ صاحب نے انارکلی میں بالائی منزل پر دفتر
لے لیا ہے آپ وہاں پہنچے تو حفیظ صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے۔ آپ نے کاغذ
کے ایک ٹکڑے پر یہ شعر لکھے اور وہ پرزہ ان کی میز پر چھوڑ کر آ گئے۔

دفتر جو بالاخانے پہ دیکھا حفیظ کا — محرم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا

رونق ہوئی انارکلی کی چہار چند — بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا

جن منزلوں پہ حسن کبھی جلوہ ریز تھا
اب عشق اُن میں مائلِ فریاد ہوگیا

سنہ ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے راولپنڈی میں انجمن اسلامیہ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ والد بھی شریکِ بزم تھے جب حفیظ اپنی نظم پڑھ چکے تو والد نے کہا ؎

حفیظِ خوش نوا بزمِ سخن میں
قیامت تک رہے گی یاد تیری

نشاط آگیں ترے نغماتِ رنگیں
غم افزائے جہاں فریاد تیری

کیا پابندِ نے نالے کو تو نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری

اسی جلسے میں حفیظ صاحب نے منتظمین کی فرمائش پر چندے کی اپیل کی، اور اپنی نظم "مسدسِ حال" پڑھی جس کے اس وقت کہیں کہیں سے مصرعے مجھے یاد ہیں ؎

مرے شیخ ہیں شیخ سر عبدِ قادر
ہوا اُن کی جانب سے فرماں یہ صادر

نہیں چاہتے ہم سخن کے نوادر
... ...

ہے مطلوب ہم کو نہ گریہ نہ خندہ
سُنا نظم ایسی ملے جس سے چندہ

مسدس بہت طویل تھا اور پھر بزبانِ حفیظ۔ حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ چندہ بھی خاصا جمع ہوا اور وعدے تو ہزاروں تک پہنچ گئے۔ جب چندہ بازی کی افراتفری ختم ہوئی تو والد نے صدرِ بزم قبلہ شیخ سر عبد القادر سے جو ان کے قریب تشریف فرما تھے مخاطب ہو کر کہا ؎

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو بندہ نواز
بنا ہے گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور یہ شعر حفیظ صاحب کو سنایا حفیظ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے، اور قبلہ شیخ صاحب نے اسی چندے کے موضوع پر اکبر الہ آبادی کے متعدد اشعار سنادیئے۔

اجلاس تھوڑی دیر کے لئے برخاست ہوا۔ غالباً نماز کے لئے۔ حفیظ صاحب نے اعلان کردیا کہ حضرات! جناب محروم دوسری نشست میں بھی اپنا کلام سنائیں گے، والد کے پاس دوسری نشست کے لئے کوئی نظم نہ تھی۔ وقت بھی بہت کم تھا، لیکن چونکہ اعلان ہو چکا تھا، انھوں نے کاغذ پنسل لے کر نظم کہنا شروع کردی، اور جب چند لمحوں کے بعد ان سے کلام سنانے کے لئے کہا گیا تو یہ اشعار ان کی زبان پر تھے ؎

اے ملتِ اسلام! ترے ذوقِ سخن سے
فردوسِ نظر عالمِ معنیٰ کا ہے گلزار

ہر سو دیہاں مصرعۂ برجستہ ہے گویا
اشجار سے پیدا ہے ترے عالمِ اشعار

مستانہ کسی کنج میں عاشق ہیں نوا سنج
عارف ہیں کہیں نغمہ سرا با دلِ ہشیار

ہیں فلسفی اک سمت خراماں روشوں پر
دامانِ ترنم میں لئے گوہرِ افکار

جھلکی نظر آتی ہے یہاں حسنِ ازل کی
کتنا متجلی ہوا آئینۂ گفتار

اعجاز سے کچھ کم نہیں یہ نطق کا جادو
بے پردہ ہوئے جاتے ہیں خود روح کے اسرار

تبریزی و رومی کی نواؤں سے ہے پیہم | وہ حسن کی بارش کہ ہے جاں مطلعِ انوار
ہے روحِ بشر اس کے تجسس میں ازل سے | جس حسن کے ہیں پردہ کشا جامی و عطار

نغموں سے ہے لبریز ہوا تیرے چمن کی
کتنی ہے دل آویز فضا تیرے چمن کی

علامہ اقبال کا مرثیہ بھی انھوں نے اقبال کی موت کی خبر سنتے ہی فی البدیہہ کہا تھا۔ علامہ کے انتقال کی خبر ریڈیو پر آئی تو انھوں نے اسی وقت مرحوم کے اعزاز میں اسکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آئے۔ مجھے بتایا کہ اقبال اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر کہنے لگے ایک دو شعر میں لکھواتا ہوں تم لکھ لو۔ میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی، آپ حقے کے ہر کش پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ نوحے کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

جب آپ یہ اشعار لکھوا چکے ؎

کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر | قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا | ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا
باغِ جہاں میں صورتِ گل ہائے تر رہا | باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گو ہرِ شبنم نہاں نہیں | خورشید جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق" روشن تر اس حقیقت روشن کو کر گیا

تو میں نے کہا کہ اس نظم میں آپ "مر گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے؟ کہنے لگے کیوں؟ میں خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ "مر گیا" کا قافیہ شعر کو بے جان کر دے گا، انھوں نے آخری شعر لکھوایا، اور وہ شعر یہ ہے ؎

محروم! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو

یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں کس قدر غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آ گئی کہ وہ ہال ہم لوگوں کو نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا، اسے ملتوی کرنا اب ہمارے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب میونسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام مدعوئین کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والہ بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے۔ اور اپنی نظم سے پہلے مقام جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن!

ماتمِ اقبال باید کرد در صحنِ چمن

دفار انبالوی کے ساتھ بھی ان کے مراسم بے تکلفی کی حد تک دوستانہ ہیں۔ دفار صاحب پہلے روزنامہ "پرتاپ" میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے "احسان" میں آ گئے،

والد کی ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ؎

جس دن سے اُدھر سے تو اِدھر آیا ہے | چشمِ بینا کو کم نظر آیا ہے
"احساں" پہ بھی احساں تھا ضروری لیکن | "پرتاپ" کو بے وقار کر آیا ہے

یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، وقار صاحب نے یونہی باتوں میں ان سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ والد ایک آدھ منٹ تک خاموش رہے پھر بولے ؎

ہو لاکھ مئے خودی سے ہٹلر سرمست | ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی | کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر شاعر ایڈیٹر۔ ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقار نے فوراً یہ رباعی لکھ لی، اور اگلے دن اپنے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کر دی۔

اسی سفرِ لاہور کا ذکر ہے، وقار اور والد اکٹھے جا رہے تھے، دیواروں پر جا بجا سنیما کے پوسٹر نظر آئے، ان پر وہی عام تصویریں تھیں، نیم عریاں۔ وقار نے تصویروں کی جانب اشارہ کیا، اور کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ والد نے جواب میں کہا ؎

لبِ عشرت پہ تبسّم نظر آتا ہے مگر! | آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں
خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا | منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں

سنیما دیکھنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے زندگی بھر میں آپ نے دو چار تصویریں ہی دیکھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بھی جہاں تک اخلاقیات کے عام اصولوں کا تعلق ہے آپ صرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہی نہیں رہے بلکہ بقول مولینا عبدالمجید سالکؔ "ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلم اخلاق رہے ہیں۔" ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی مجھے ایک باقاعدگی اور ضابطہ نظر آیا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انھیں صبح کے ناشتے میں دودھ کے ایک گلاس کے سوا کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ اُن کا یہ طریقہ آج تک جاری ہے۔ گھر پر تو اس معمول میں تبدیلی ہونے کا سوال ہی نہیں۔ سفر میں ہوں تو بھی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس میں بے قاعدگی نہ ہو۔ چائے یا لسی سے انھیں کوئی رغبت نہیں۔ لسی تو جو بقول پنجاب کی "قومی غذا" ہے وہ بالکل استعمال نہیں کرتے۔ چائے کے لئے روز ابر کا ہونا شرط ہے۔ دودھ کے بعد پھلوں کا نمبر آتا ہے، اور پھل کے بارے میں اس قدر "احتیاط" سے کام لیتے ہیں کہ پھل بالکل بے ذائقہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک پھلوں کا چھلکا بہت مُضر چیز ہے، اس سے پرہیز لازمی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت وہ انگور تک کا چھلکا اُتار لیتے ہیں۔ گھر کے باقی لوگوں کو انگور کھانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہیں۔ اکثر اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ جہاں تک انگور کا تعلق ہے وہ اسے چھیلنا ترک کردیں۔ لیکن وہ اپنی وضع پر قائم ہیں۔

صحت کے پیشِ نظر وہ ٹماٹر بھی اکثر استعمال کرتے ہیں، اور اس کا بھی چھلکا

اُتار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھلکا اتار لینے کے بعد ٹماٹر میں کیا باقی رہ جاتا ہوگا۔
شاید انہی باقاعدگیوں کا اثر ہے کہ صحت ان کی اس وقت تک اچھی ہے لیکن بعض
عارضے ایک زمانے سے ان کے ساتھ ہیں۔ لڑکپن میں جب تیراکی کا شوق تھا تو
دریائے سندھ میں ایک بار گہری چھلانگ لگائی۔ شوق تو پورا ہوگیا لیکن "ہرنیا"
مستقل طور پر زندگی کا رفیق بن گیا۔ یہ اور اس کے ساتھ عرق النساء دونوں
کبھی کبھی بڑی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ
دوائیں آپ کی ہر لحظہ کی ساتھی ہیں۔ باہر کہیں سفر پر جاتے ہیں تو دس بارہ دوائیں
اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نمک، مرچ اور چینی وغیرہ شیشیوں
میں بند کر کے الگ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مشاعرے میں کہیں جاتے ہیں تو تمام
شعراء کے لئے ان کی دواؤں کی میز حیرت کا باعث ہوتی ہے۔ دوائیں ساتھ لیکر
اُن کی سفر کی عادت شعراء میں بہت شہرت پاچکی ہے۔ ایک دفعہ لائل پور میں مشاعرہ
تھا، قتیل شفائی والد سے ملنے آئے، جہاں شعراء کا قیام تھا وہاں دو چار کمروں
میں دو گئے، والد موجود نہیں تھے۔ ایک کمرے میں میز پر مختلف دواؤں کی بیس
پندرہ شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ اُن کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہی
کمرہ والد کا تھا۔

اتفاق کی بات ہے اُسی مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سامعین کا ہجوم
دیکھ کر بیہوش ہوگئے۔ رات کا ڈیڑھ بجے کا وقت تھا، ہم لوگ ان کو بڑی مشکل سے

قیام گاہ تک لے آئے۔ والد کے پاس امرت دھارا" موجود تھی، اُس وقت وہ کام آئی، اور شاعر صاحب اگلی صبح اچھے بھلے ہو کر رات کے مشاعرے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا، اور ایک نسل ان کا کلام پڑھتی چلی آرہی ہے۔ اس لئے ان کی عمر کے بارے میں اکثر غلط اندازے موجود ہیں۔ ایک بار جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد اُن سے ملنے گئے۔ اُنھوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا، اور کہنے لگے میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اب آپ بمشکل لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ حیرت انگیز طور پر غلط تھا۔ اس واقعے کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں اور آج بھی جبکہ والد کی عمر تقریباً ستر برس کی ہے آپ عصائے پیری کا سہارا لئے بغیر باقاعدہ کالج جاتے ہیں، اور اب اُس چھڑی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے جو چند برس پہلے اُن کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی۔

"نقوش" لاہور (شخصیات نمبر)

اکتوبر ۱۹۵۶ء

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸	۴	سنہ 1957ء ہی میں	عنقریب
۹	۳	حصّہ	حصّۂ
۱۴	۱۵	بھرے	بھر دے
۳۲	۵	سُنا	پڑھا
۳۳	۶	وثوقی	وثوق
۳۶	۵	اُن سے	مجھ سے
"	۶	کسی	کی
۴۴	۱۵	بند کا شعر	ٹیپ کا شعر
۷۱	۱۵	برگ و یاسمن	برگ یاسمن
۷۲	۲	مانند	مانند
۷۶	۶	عریاں پر	عُریانی تر
۸۴	۱۴	ہر کرۂ زمیں	ہر لحظہ کرۂ زمیں
۱۰۵	۱	نثار	فشار
۱۲۰	۱	دسمبر سنہ 1885ء	جولائی سنہ ۱۸۸۶ء
"	۶	گھنے باغ	سبز میدان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲۰	۱۳	ایک خوش حال	معمولی حیثیت کے
۱۲۱	۹	۱۹۰۵ء	۱۹۰۲ء
۱۲۲	۱۰	ورنیکولر مڈل سکول	اینگلو ورنیکولر مڈل سکول
۱۴۱	۱۱	بقا	بقا
۱۴۴	۱۱	جگرسے	جلوسے
۱۴۷	۷	گاؤں عیسیٰ خیل	گاؤں واقع عیسیٰ خیل
۲۰۰	زیرِ عنوان	ہر بھگوان پرشاد	ہر بھگوان شاد
۲۰۱	۱۲	اصلاح نہیں کی	اصلاح نہیں لی
۲۰۲	۹	۱۹۱۶ء	۲۵-۱۹۱۶ء
۲۱۰	۲	دل ہے	دِن تھے
۲۱۶	۱۵	محروم کی	کلامِ محروم کی
۲۲۷	۸	شکل	کہ شکل
۲۳۷	۲	کھپاتے	کھینتے
۲۴۶	۱۳	ایک مدت تک	چند روز
"	"	ڈاکٹر نیل	دہاں
"	"	انگریز	سکھ
۲۵۶	۱۴	نسم	نظم
۲۶۱	۱	منزلوں پہ	منزلوں سے

دہلی کتاب گھر

کی

کتابیں

تلوک چند محروم کی دوسری تصانیف

نیرنگِ معانی
نظمیں اور قطعات

(زیرِ طبع)

کاروانِ وطن
قومی، ملکی اور سیاسی نظمیں

(زیرِ طبع)

شعلۂ نوا
غزلیں

(زیرِ طبع)

بہارِ طفلی
بچوں کی نظمیں

(زیرِ طبع)

ادارۂ فروغِ اردو، امین آباد پارک لکھنؤ

رُوپ

چھپنے کے پہلے ہی سے کوئی کتاب اس طوفانی طور سے مشہور نہیں ہوئی تھی جس طرح فراق گورکھپوری کی سنگار رس کی رباعیوں کا یہ مجموعہ "حواس خمسہ اور اعضا جسمانی، ان ترانوں میں رُوح کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان رباعیوں میں برقِ طور کی چمک ہے، اور جنت کی ہواؤں کی ٹھنڈک۔ ہر رُباعی کے ایک ایک لفظ سے سات رنگوں کی پھوار ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ شعور جمال آفاقی کلچر اور آفاقی ادب کے شاہکاروں میں ہی نظر آتا ہے۔ بقول مولانا نیاز فتحپوری فراق نے اس صنفِ سخن میں لطیف ترین بُت گری سے کام لیا ہے۔ ان رباعیوں میں مغربی کلچر بھی ہے اور ایرانی کلچر بھی، یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ بھی ان میں موجود ہے، اور قدیم ہندو اور بودھ آرٹ کا رقص و نغمہ بھی"

(نگار مئی ۱۹۴۵ء)

تین روپے آٹھ آنے

ادارۂ فروغِ اُردو، امین آباد پارک، لکھنؤ

بیکراں

جگن ناتھ آزاد کا پہلا مجموعۂ کلام

آپ کے کلام سے جو مسرت اور سرور ہوتا ہے وہ بیان میں نہیں آسکتا۔

(مولوی) عبدالحق
کراچی۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

آپ کا کلام مقبولیت کی بلند ترین چوٹیوں کو چھو رہا ہے۔ کیوں نہ ہو خلوص کبھی بے نتیجہ نہیں رہتا۔

(مولانا) عبدالمجید سالک
لاہور۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۴ء

"بیکراں" کا نیا ایڈیشن دیکھا۔ سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ آپ کی ذات پر اُردو کو جتنا بھی ناز ہو کم ہے۔

اقبال عظیم
چاٹگام۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء

"بیکراں" اُردو ادب میں ایک دلکش اضافہ ہے۔

صفیہ شمیم ملیح آبادی
راولپنڈی ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء

آزاد نے قدیم ادب کی بہترین روایات اور جدید رجحانات کے بہترین عناصر کو اس طرح باہم سمو لیا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی شاعری ایک حسین گلدستہ بن گئی ہے۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ
۲۴ جنوری ۱۹۵۴ء

تقسیم ملک کے بعد افقِ شاعری پر جتنے ستارے اُبھرے ہیں اُن میں جگن ناتھ آزاد اپنی تابناکی سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کل دہلی
نومبر ۱۹۵۴ء

تیسرا ایڈیشن۔ قیمت چار روپے پچاس نئے پیسے

ادارہ فروغِ اردو۔ امین آباد پارک، لکھنؤ